# برکت ایک چھینک کی

مزاحیہ افسانوں اور خاکوں کا ایک انتخاب

وجاہت علی سندیلوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

# برکت ایک چھینک کی

وجاہت علی سندیلوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

Barkat Ek Chhink Ki
by
Wajahat Ali Sandailvi
Rs.53/-

## صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

## شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ھیں

سنہ اشاعت: 2011　　تعداد: 1100　　قیمت: -/53

ISBN : 978-81-7587-594-4　　سلسلۂ مطبوعات: 1469

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000　فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com　ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

# معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلّی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطّل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

مینجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

# فہرست

# برکت ایک چھینک کی

میری بھابھی جان ساری دنیا کے لیے تو بہت خلیق، با مروّت اور ہنس مکھ واقع ہوئی تھیں لیکن صرف مجھ سے یعنی اپنے اکلوتے دیور سے جو اپنے والدین سے دُور اُن کی اور بھائی صاحب کی سرپرستی میں زیرِ تعلیم تھا۔ ہر وقت منہ پھُلائے رہتیں اور خدا لگتی پوچھیے تو اس میں ان کا قصور کم اور میرا پاجی پن زیادہ تھا۔ میرے اس پاجی پن میں درپردہ بھائی صاحب کی شہ اور ہمت افزائی بھی شامل تھی۔

بھابھی جان کی ایک بہت چہیتی چھوٹی بہن شمیم تھی جو میری ہی طرح بی اے کی طالب علم تھی۔ اس کی تعریف و توصیف کرنے اور نت نئے گن گانے سے ان کا منہ کبھی نہ تھکتا۔ بات چاہے ایران اور توران کی ہو رہی ہو لیکن وہ کسی طرح کوئی پہلو نکال کر اپنی "شمو" کی شان میں کوئی بے ساختہ قصیدہ ضرور پڑھ دیتیں "میری شمو یہ کام ایسے کرتی ہے۔" "میری شمو وہ کام ویسے کرتی ہے۔" "مجال کیا جو میری شمو کے سر سے دوپٹہ سرک جائے۔" "میری شمو کی تہذیب اور شائستگی میرے یہاں سارے قصبے میں مشہور ہے۔" "بڑے بڑے باورچی اور رکاب دار میری شمو کے پکائے ہوئے کھانے پر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔" "فلاں درزی کے سیے ہوئے کپڑے میں میری شمو نے ایسا نقص نکال دیا کہ وہ بس جھینپ کر کلا بتو ہو گیا۔" "میری شمو اپنے درجے میں ہمیشہ اول آتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

ہو سکتا تھا کہ میں یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا اور بھابھی جان سے بدمزگی نہ مول لیتا۔ لیکن نہیں معلوم کیوں شمیم کی مدّاح سرائی سنتے سنتے مجھے اس سے ایک قسم کی چڑھ اور کدورت سی ہو گئی تھی اور جیسے ہی بھابھی جان اس کی کوئی نئی خوبی بیان کرنے لگتیں میں خود اس خوبی میں سیکڑوں کیڑے ڈالنے اور اس کو خوبی کے بجائے خرابی ثابت کرنے لگتا، یا پھر اس کے متعلق ایسے مضحکہ خیز اور طنزیہ سوال کرنے لگتا کہ بھابھی جان فوراً برہم اور برافروختہ ہو کر مجھ پر نکتہ چینی اور میری ہجو کرنے پر اُتر آتیں اور پھر جب بات بہت زیادہ "ذاتیات" تک پہنچ جاتی تو بھائی صاحب ہنستے ہوئے بھابھی جان سے فرماتے: "تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ تم اس حاسد کے سامنے شمیم کا ذکر ہی مت کیا کرو۔" اور مجھ سے آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہتے: "ٹھیک تو کہتی ہیں تمھاری بھابھی تم سینما بہت جاتے ہو اور ہر وقت اپنی کتابیں پڑھنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی فضول ناولیں اور رسالے

دیکھا کرتے ہو" اور ان کی باتوں سے بھابھی اور لہجے سے ہیں، مطمئن ہو کر اپنی لفاظی کی کبڈی کسی آئندہ موقع کے لیے ملتوی کر دیتے۔

ایک روز ناشتے پر میرے ہاتھ میں ایک باتصویر انگریزی رسالہ دیکھ کر بھابی جان بولیں: "میری شمو تو اس قسم کے رسالوں پر تھوکتی بھی نہیں۔"

"اسی وجہ سے تو اس رسالے کی اشاعت ایک لاکھ سے بھی زائد ہے۔" میں نے کہا۔

نہیں معلوم کیوں اس روز بھابھی جان کچھ خاص طور سے بھری بیٹھی تھیں لہٰذا بلا کسی تمہید کے فوراً ذاتیات پر اُتر آئیں۔ "صرف سوٹ پہن لینے اور انگریزی بال بنا لینے سے انسان مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتا ہے اس کے لیے قابلیت اور ذہانت چاہیے اور اس میں ماشاءاللہ آپ بالکل ہی صفر ہیں۔" اور پھر اس کے بعد انھوں نے میرے انگریزی بالوں کو میری حماقت، میری فیشن پرستی کو میری جہالت، میری سینما بینی کو میرے شُہد پن اور میرے باتصویر رسالوں کے مطالعے کو میری بے ہودگی اور بدتمیزی سے تعبیر کر ڈالا۔

ان کا حملہ کچھ اس قدر غیر متوقع اور بے محل تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی، اس کو میری بے غیرتی سے منسوب کرتے ہوئے وہ اور بھی جُلبلا گئیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھے اور کچھ کہتیں درمیان میں بھائی صاحب کے منہ سے نہیں معلوم کیسے یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ نکل گیا "تم اس کی تربیت کے لیے شمیم کو اس پر کیوں نہیں تعینات کر دیتیں یہ اس کے چپلوں کی زد میں آ کر خود بخود سُدھر جائے گا۔" یہ جملہ ایک پٹاخا ثابت ہوا اور بھابھی جان واقعی غصے میں آ کر کسی زخمی شیر کی طرح بپھر اٹھیں، خوب خوب صلواتیں انھوں نے مجھ کو، بھائی صاحب کو، بلکہ میرے خاندان کو سنا ڈالیں اور بار بار ٹیپ کے بند کے طور پر کچھ اس قسم کے کلمات دُہراتیں "یہ منہ اور مسور کی دال!" "کوے کی چونچ میں انگور؟" "میری شمو کے دشمنوں کے منہ میں خاک۔" "میں اپنے جیتے جی تو اپنی شمو کو ایسے نکھٹو کے حوالے کر نہیں سکتی۔ ایسی ہی اس کی قسمت پھوٹی ہے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا داب کر رکھ دوں گی!" وغیرہ وغیرہ۔ بڑی مشکل سے بے چارے بھائی صاحب اُنھیں قائل کر سکے کہ خدانخواستہ ان کا روئے سخن کسی نسبت یا رشتے کی طرف نہیں تھا بلکہ انھوں نے محض تفریحاً اپنا جملہ معترضہ کہہ دیا تھا ورنہ کہاں شمیم جیسی ہمہ صفت موصوف لڑکی اور کہاں ان کا بھائی جیسا بانگڑو لڑکا؟

ایک روز شام کو گھوم پھر کر میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک ہل چل سی مچی ہوئی ہے اور گھر کا ہر فرد خواہ چھوٹا یا بڑا انتہائی انہماک سے گھر کی صفائی اور آرائش میں مشغول ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل شمو بی بی آ رہی ہیں اور ان کے استقبال کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ میری صورت دیکھتے ہی بھابھی جان نے "حکم امتناعی" سنا دیا "دیکھو میاں! کل شمو آ رہی ہے۔ وہ تم سے پردہ کرتی ہے لہٰذا تم باہر اپنے کمرے ہی میں رہنا۔ میں تمھارا ناشتہ اور کھانا وہیں بھجوا دیا کروں گی۔ اندر نہ آنا اور وہاں باہر سبزے پر بھی نہ نکلنا کیونکہ جاڑوں کے دن ہیں اکثر ہم لوگ

نکل کر دُھوپ میں بھی بیٹھیں گے۔" میں نے بڑی سعادت مندی سے "بہت اچھا" کہا تو میری سزا میں کچھ تخفیف کر دیے جانے کی امید دلادی گئی۔ "ارے چار پانچ روز کی تو بات ہے۔ تم کو تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن پھر کیا کیا جائے؟ اتنی مختصر تو کوٹھی ہے۔" میں نے پھر بڑی شرافت سے جواب دیا "مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔"

شمیم آئی تو واقعی ساری کوٹھی پر ایک نشاط انگیز فضا چھاگئی۔ اس نے میرے آٹھ سال کے بھتیجے جمال اور چھ سال کی بھتیجی حمیدہ کے ساتھ خوب ہڑدنگا اور شوروغل مچایا۔ میرے حصے میں صرف چند نقرئی قہقہوں کی جھنکار آئی اور بس۔ جمال اور حمیدہ سے کُرید کر پوچھا تو پتا چلا کہ ان کی خالہ دراصل شیطان کی خالہ واقع ہوئی ہے۔ اپنی شوخی اور شرارت سے ہر وقت وہ کھلاتی رہتی اور کسی وقت بھی نچلا بیٹھنا تو وہ جانتی ہی نہ تھی۔

ایک روز میں یونیورسٹی سے پلٹا تو اپنے کمرے کو ایک عجیب و غریب حالت میں پایا۔ معلوم ہوتا کہ پانی پت کی چوتھی لڑائی میرے ہی کمرے میں میری کتابوں، جوتوں، کپڑوں اور کرسی میزوں وغیرہ سے لڑی گئی تھی۔ میں نے کمرے کی ہر چیز کو الٹا پایا۔ حتیٰ کہ دیوار پر تصویروں کے بجائے جوتے ٹنگے ہوئے تھے اور جوتوں کی جگہ تصویریں اوندھی پڑی تھیں۔ بے ترتیبی اور انتشار کا ایک عجیب عالم تھا۔ میرا لحاف زمین پر پلنگ کے نیچے قالین کی جگہ بچھا ہوا تھا۔ قالین کو الگنی پر پھانسی دے دی گئی تھی۔ ایک چادر میں بکس سے نکال کر میرے کپڑے گنجیٹ دیے گئے تھے اور بکس میں ردّی اخبارات بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پہلے تو دل چاہا کہ بھابھی جان کو بلا کر یہ حماقت افزا منظر دکھاؤں لیکن پھر میری حمیت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ آتش دان پر رکھی ہوئی میری تصویر کے بڑی بڑی مونچھیں بنا کر عینک لگادی گئی اور روشنائی سے ایک آنکھ کی تخفیف کر دی گئی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا "حمیدہ کے چچا پھکڑی مل گھامڑ داس۔"

دوسرے دن میں نے اپنا کیمرہ نکالا اور دوپہر میں جب کہ سارا گھر سمجھ رہا تھا کہ میں یونیورسٹی گیا ہوا ہوں اور شمیم باہر سبزے پر جمال اور حمیدہ کے ساتھ اُچک پھاند میں مصروف تھی میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے جو اکثر دوسرا شو دیکھ کر واپسی پر کھڑکی کی شٹکنی کھولنے اور کمرے میں داخل ہونے میں بڑی مدد دیتا، شمیم کی مختلف زاویوں سے تصویریں اُتارنا شروع کر دیں۔ میں تصویریں اتارتا جاتا اور ان کے عنوانات میرے ذہن میں خود بخود اُبھرتے جاتے۔ "دوپٹے سے رسّہ کشی" "کیچڑ میں مینڈھک جھاڑی میں خرگوش" "پردے کا زردہ" "شمیم بانو ایک باتصویر فلمی رسالے پر تھوک رہی ہیں" وغیرہ وغیرہ اور پھر دوسرے ہی دن حمیدہ کی معرفت ان تصویروں کی ایک ایک کاپی عنوانات کے ساتھ شمیم کے پاس بھیج دی گئی۔ جمال نے اس کو یہ دھمکی بھی سنادی "ان تصویروں کی ایک ایک نقل اور ساتھ میں چچا جان کی وہ تصویر جو آپ نے خراب کی تھی امی جان کو بھی پہنچنے والی ہے۔" ـــ اس کے بعد میرے کمرے پر کوئی دوسرا حملہ نہیں کیا گیا۔

اور پھر جب کہ دوسرے دن شمیم واپس جا رہی تھی رات میں ایک خوشگوار قسم کا بہت ناخوش گوار حادثہ پیش آگیا جس سے اس کے سامنے میری شرافت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی۔

آٹھ بجے رات کو ایک دم سے پوری کوٹھی کی بجلی فیل ہو گئی۔ میں بھائی صاحب کے پاس برآمدے میں بیٹھا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ سامنے لائبریری میں جاکر آتش دان پر سے اُن کی ٹارچ اٹھا لاؤں۔ لائبریری میں گھُپ اندھیرا تھا۔ میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے آگے بڑھا تو میرا دایاں ہاتھ کسی کے ملائم چہرے پر پڑا اور پھر ایک نازک سی عینک میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے بھینچے دبا اور ساتھ ہی مجھے ایک گلوگیر چیخ سی سنائی دی۔ میں نے لپک کر ٹٹولتے ہوئے ٹارچ اٹھا کر جلائی۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ شمیم آنکھیں جھپکاتے ہوئے لال پیلی ہو رہی تھی میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو اس کی عینک پیش کی لیکن قبل اس کے کہ میں کوئی معذرت کر سکوں اس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے اپنی عینک نوچ لی اور پیر پٹخ "کرلو فر" "بدمعاش" کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز وہ اپنے گھر واپس چلی گئی اور میرے لیے میری حماقت کی ایک تلخ یاد باقی رہ گئی البتہ میں اس بات پر یقیناً اس کا شکر گذار تھا کہ اس نے اس واقعے کا کوئی ذکر بھابھی جان سے نہیں کیا ورنہ نہیں معلوم مجھ پر کون سی قیامت گزر جاتی۔

بھابھی جان کے مرحوم چچا میرے پھوپھا تھے۔ امتحان ختم ہو جانے کے بعد جب میں گھر جانے لگا تو بھائی صاحب کی ہدایت پر میں علی گڑھ اپنی پھوپھی سے ملنے گیا۔ باہر بیٹھکے میں بھابھی جان کے والد مولانا عبدالقدوس صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ بڑی شفقت اور تپاک سے ملے۔ بڑی دیر تک مجھے بہت سی نصیحتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں مجھے میری پھوپھی کے پاس بھیج دیا۔

عبدالقدوس صاحب کا پرانے زمانے کا بنا ہوا بڑا عالی شان مکان تھا اور اب غالباً اس کا تین چوتھائی حصہ غیر آباد تھا۔ میرا رہبر لڑکا پہلے تو مجھے بروٹھے سے ایک وسیع صحن میں لے گیا جس کے سامنے ایک شان دار بیچدرا اور چاروں طرف تدداریاں بنی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ایک زینے پر چڑھا۔ اس کے بعد ایک کوٹھے پر سے گزر کر وہ داہنی طرف مڑ گیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ ایک دم سے غائب ہو چکا تھا اور میں اس شعر کی تفسیر بن کر رہ گیا تھا ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے ؛ اب کسے رہنما کرے کوئی

اس موڑ پر میرے سامنے دو دروازے تھے۔ میں دونوں دروازوں پر خوب کھنکھارا۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ پیر پٹخے "ابے او لڑکے" چیخا لیکن کوئی جواب نہ ملا سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے واپس ہونے پر بھی راستہ بھول جانے کا احتمال تھا کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ یہ مکان کیا پوری

بھول بھلیاں تھا۔ چار و ناچار میں ایک دروازہ کھول کر آگے بڑھا۔ سامنے پھر ایک بڑا صحن تھا لیکن اس کے داہنے کونے پر جو دروازہ تھا اس سے آبادی کے کچھ نشانات ظاہر ہوتے کیونکہ دو قطاروں میں پھولوں کے کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اس دروازے پر دستک دی تو اندر سے شمیم کی آواز آئی — "کون؟" میں نے پٹ کھول کر ذرا جھانکا تو دیکھا کہ شمیم سامنے نیچی کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہلے تو چونک پڑی لیکن پھر اس نے تعجب سے تیوریاں چڑھالیں —

میں نے کہا: "سلام علیکم۔"

اس نے جواب دیا: "وعلیکم السلام! اس وقت یہاں آپ کی شانِ نزول کیا ہے؟"

میں نے کہا: "راستہ بھٹک کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہوں۔"

وہ آنکھیں نکال کر مصنوعی غصّے سے بولی: "کیا مطلب آپ کا؟"

میں: "ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں پھوپھی جان کے پاس جا رہا تھا لیکن وہ لڑکا درمیان ہی میں کہیں غائب ہوگیا اور میں بھٹک کر آپ تک پہنچ گیا —"

شمیم: "تو جائیے جس دروازے سے آپ یہاں تک آئے ہیں اُسی کے برابر والا دروازہ چچی جان کے کوٹھے پر کھلتا ہے۔"

میں: "لیکن مجھے آپ سے ایک معافی بھی مانگنا ہے۔"

شمیم: "تو جلدی سے مانگ لیجیے اور تشریف لے جائیے۔ غالباً آپ کو اس کا احساس نہیں کہ میرے اور آپ کے درمیان سرکاری طور سے پردہ ہے اور آپ کا اس طور سے میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہونا انتہائی معیوب ہے۔"

میں: "اچھا تو میں کمرے کے اندر حاضر ہوکر معافی مانگے لیتا ہوں۔" اور میں کمرے میں اندر داخل ہوکر اس کی کرسی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا:

شمیم: (گھبراکر) "ہٹائیے یہ معافی وغیرہ کی باتیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے کوئی آجائے گا تو کیا کہے گا۔"

میں: "آپ اپنی بداخلاقی کا الزام کسی دوسرے پر کیوں تھوپنا چاہتی ہیں؟"

شمیم: "آئے تھے آپ معافی مانگنے اور الٹا مجھی کو بداخلاق بنا رہے ہیں۔"

میں: "اس روز اندھیرے کے حادثے کا ذمہ دار صرف اندھیرا تھا۔"

شمیم: "اور تصویریں خود بخود کیمرے میں اُتر آئی تھیں۔"

میں: "اور میرے کمرے میں شاید کسی بھوت نے گھس کر غدر مچایا تھا۔"

شمیم: "اس کارِ خیر میں محلے کی کئی لڑکیاں شریک تھیں!"

میں: "اور جن کی رہنمائی آپ نے فرمائی تھی؟"

شمیم: "(ہنستے ہوئے) اچھا پکڑی مل گھا مٹر داس جی! اب یہ انٹرویو ختم ہو جانا چاہیے۔ میں۔" بشرطیکہ آپ ایک دفعہ پھر مجھے لوفر اور بدمعاش کہہ دیں۔"

شمیم۔" سمجھ لیجیے کہ کہہ دیا۔ لیکن اب خدا کے واسطے جائیے۔ آپ جانتے نہیں کہ والد صاحب پردے کے کس شدت سے پابند ہیں۔"

اور پھر دفعتاً باہر صحن میں بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کسی نے پکارا "شمیم!"

"جی! اباجان" شمیم نے بدحواسی سے جواب دیا۔ میں سراسیمہ کھڑا تھا۔ قدموں کی آواز قریب تر ہو گئی۔ شمیم نے انتہائی گھبراہٹ میں مجھے اشارہ کیا اور میں غڑاپ سے صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔

مولانا عبدالقدوس صاحب کمرے میں آکر اسی صوفے پر جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا بیٹھ گئے اور گھر کی کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے "وہ آج نسیم کا دیور اپنی پھوپھی سے ملنے آیا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ عجیب بوگھل لڑکا دکھائی پڑتا ہے۔"

اور عین اس موقع پر روکنے کی انتہائی کوشش کے باوجود میں نے ایک زبردست چھینک چھینک دیا —!

مولانا عبدالقدوس صاحب غالباً ایک فٹ صوفے کے اوپر اچھل گئے۔ کیونکہ ہوا میں پرواز کے چند لمحوں کے بعد جب وہ صوفے پر واپس گرے تو اس کا ہر اسپرنگ بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔ شمیم منہ پھیر کر صوفے کے ایک کونے میں گر گئی اور میں سر جھکا کر خاموشی سے یوں کھڑا ہو گیا جیسے

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

پردے کے زبردست حامی مولانا عبدالقدوس نے اس معصوم ڈرامے سے یقیناً بدترین نتائج اخذ کیے تھے۔ ان پر ایک دم سے شدید قسم کا پاگل پن کا دورہ پڑ گیا "شیطانو! ملعونو! کمبختو! تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ میری ناک کاٹ لی۔ میرے چہرے پر سیاہی مل دی میری! وغیرہ وغیرہ۔" وہ چیخے گرجے۔ تڑپے اور پھر انھوں نے اپنے سر کے بال اور داڑھی نوچ کر رکھ دی! شمیم نے سسکیوں کے درمیان کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے لپک کر اس کے ایک چھڑی رسید کی۔ میں بچانے کے لیے آگے بڑھا تو مجھ پر تابڑ توڑ کئی چھڑیوں کی بارش سی ہو گئی۔ میں فرش پر گرا تو کئی لاتوں سے ضیافت کی گئی۔ "کمینہ۔ آوارہ — بدمعاش۔ جہنمی" اور نہیں معلوم کن کن خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

کافی مار دھاڑ کے بعد مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا "چل باہر ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں تجھے۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی شریف کی ناموس میں بٹہ لگانے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟" میں نے لاکھ کچھ کہنا چاہا مگر مولانا کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ میں جیسے ہی بولنے کے لیے منہ کھولتا وہ فوراً ایک کرھیٹر رسید کر دیتے۔ مارتے کوٹتے وہ مجھے

ایک دوسرے کو ہٹے پر لے گئے اور ایک تنگ اور تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔
میں سمجھتا تھا کہ اس کوٹھری سے براہ راست مجھے کسی جلاد کے پاس مقتل گاہ بھیج دیا جائے گا۔ لیکن چند ہی گھنٹوں بعد مجھے اس سے نکال کر ایک قاضی اور چند گواہوں کے سامنے پیش کیا گیا اور میرا اور شمیم کا باقاعدہ نکاح ہوگیا! مولانا عبدالقدوس صاحب نے یہ بھی ایک نادری حکم لگا دیا کہ ہم دونوں میاں بیوی شام تک ان کا گھر خالی کر دیں۔ جہیز کے طور پر انھوں نے انتہائی حقارت سے ایک دستاویز مجھے گھسیٹ ماری جس میں انھوں نے پیشتر ہی سے اپنی کل جائداد اپنی دونوں لڑکیوں نسیم (بھابھی جان) اور شمیم کو دے رکھی تھی۔
ریل میں شمیم کبھی روتی کبھی ہنستی اور کبھی میری چوٹوں پر مرہم لگاتی۔ بھائی صاحب اور بھابھی جان کے سامنے جب ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے پیش ہوئے تو بھائی صاحب مارے خوشی کے چیخنے لگے "کوے کی چونچ میں انگور"۔ بھابھی کچھ دیر تو سکتے میں رہیں پھر ایک ہاتھ سے "میری شمو" کہہ کر شمیم اور دوسرے ہاتھ سے "میرا بھو" کہہ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔
واضح رہے کہ کچھ عرصے بعد مولانا عبدالقدوس صاحب سے بھی صفائی ہوگئی اور انھیں جب صحیح واقعے کا علم ہوا تو بہت ہنسے اور اپنی داڑھی میں خلال کرتے ہوئے فرمایا "جب میں صوفے پر بیٹھا تمھیں بولھل کہہ رہا تھا تو صوفے کے پیچھے تم پر کیا گزر رہی تھی"۔ میں نے بڑے ادب سے جواب دیا "میں دنیا کی سب سے قیمتی چھینک روکنے کے لیے اپنی ناک اُمیٹھ رہا تھا"۔ مولانا نے قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا: "واقعی ہم دونوں ہی کی ناکیں سخت خطرے میں پڑ گئی تھیں۔"

# حقوق ہمسایہ

میں نے ایک ضروری خط لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہی تھا کہ سامنے سے میرے ہمسایہ مرزا حیدر بیگ آتے دکھائی پڑے۔ مرزا صاحب وقت یا گھڑی کے قائل نہ تھے، ان کے خیال میں وقت کو انسان کا پابند ہونا چاہیے، نہ کہ انسان کو وقت کا۔ اور گھڑی تو محض ایک نمائشی اور تجارتی چیز ہے جس کو انسان کی بنیادی ضرورت یعنی بکواس میں ہرگز مخل نہ ہونا چاہیے، آتے ہی انھوں نے السلام علیکم کا پھندا پھینکا اور میں وعلیکم السلام کہتے ہی ان کا صیدِ زبوں ہو کر رہ گیا۔

مرزا: "تم نے میری للّی کو تو نہیں دیکھا؟"

میں (متعجب ہو کر) "للّی! یہ کون؟"

مرزا: وہی میری للّی مُرغی!"

میں: "مُرغی؟"

مرزا: "ہیں ہاں! وہی میری لال مرغی جس کے پروں کے حاشیے کچھ سیاہی مائل سنہرے سے تھے اور جس کی گردن چِتّی دار بھوری تھی اور جس کی چونچ کچھ اندر کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اور جس کے بائیں پیر کا ایک ناخن ذرا گھِسا ہوا تھا۔"

"تو پھر؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کیونکہ کسی مرغی کا اتنا تفصیلی حلیہ میرے لیے کچھ عجیب سی چیز تھی۔

مرزا: "کل شام سے نہیں ملتی۔ سہ پہر میں اس نے انڈا دیا تھا۔ پھر چار بجے جب دانہ دیا گیا تو اس وقت بھی موجود تھی اس کے بعد ایک نیولا آگیا تھا اور سب مُرغیاں شور مچاتی اِدھر اُدھر بھاگی تھیں۔ اس وقت بھی وہ باورچی خانے کے پاس والے دالان میں موجود تھی۔ لیکن پھر گھنٹہ بھر بعد جب مُرغیاں بند کی جانے لگیں تو اس کا پتا نہ تھا۔"

میں: "محلّے کے کسی مُرغے کے ساتھ ہوگی۔" کیونکہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک مرغی

کی مفرورری پر زیادہ سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کیونکہ اگر میں اس کے جاں بحق ہو جانے کے متعلق کوئی خیال ظاہر کرتا تو غالباً مرزا پر مرگی کا دورہ پڑ جاتا۔

مرزا:" چہ خوش! گھر میں ایک چھوڑ تین تین مرغے موجود ہیں! اور پھر وہ تو دوسری مرغیوں کو ساتھ لیے بغیر گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالتی تھی۔ کل شام سے میں نے محلّے کا ایک ایک کونا چھان مارا ہے۔"

میں:" رپورٹ کر دیجیے تھانے میں۔" اس کے علاوہ میں اس موضوع پر اور کچھ کہہ بھی کیا سکتا تھا اور بہرصورت مرزا سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل تو نکالنا ہی تھی۔

مرزا:" ہاں کچھ سوچ تو میں بھی رہا ہوں کہ رپورٹ کر کے چند گھروں کی خانہ تلاشی کروادوں۔"

میں:" تو یہ کام فوراً ہی ہونا چاہیے، دیر کرنے سے کیا حاصل؟" مرزا کچھ بولنے والے ہی تھے کہ دفعتاً انھوں نے جھپٹ کر میری میز کے نیچے سے کوئی چیز اٹھائی اور دروازے کے قریب روشنی میں جاکر اس کو دیکھنے لگے۔ میں نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو مرزا کی انگلیوں کے درمیان کسی پرندے کے چند بال تھے جو غالباً سڑک پر سے اڑ کر آ گئے تھے، مرزا کافی دیر تک خفیہ پولس کے کسی آفیسر کی طرح ان بالوں کا معائنہ کرتے رہے، کبھی ان کو آنکھوں کے قریب لاتے کبھی آنکھوں سے دور لے جاتے، پھر ایک آنکھ بند کر کے اور اپنی مٹھی کی دوربین بنا کر ان کو بغور دیکھا۔ اس کے بعد ان کو ملا اور سونگھا اور پھر غم اور غصّے کے ملے جلے تاثرات اپنے سیاہ چیچک زدہ چہرے پر طاری کرکے کرسی پر آکر دوبارہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر مجھے گھورتے رہے اور بالآخر بڑی خشونت سے بولے۔

مرزا:" یہ بال کہاں سے آئے؟"

میں:" کون سے بال؟"

مرزا:" یہی بال!" مرزا نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھادیا جس کی ایک انگلی پر بال کیا بالوں کے دو تین ریشے چپکے ہوئے تھے۔

میں:" آ گئے ہوں گے سڑک سے ہوا میں۔ غور سے تلاش کیجیے تو کمرے کے فرش پر ایسے بہت سے نادرات بکھرے ہوں گے، ہفتے میں ایک بار تو جھاڑو دی جاتی ہے یہاں!"

مرزا:" کئی منٹ تک فرش کو دیکھتے کیا بلکہ اپنی گہری نگاہوں سے اس پر جھاڑو دیتے رہے پھر کسی منجھے ہوئے نجومی کے لہجے میں گویا ہوئے۔

چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر قریب یارو ہے روزِ محشر
جو چپ بھی رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

خفت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے میری آواز کپکپانے لگی ۔"کیا مطلب آپ کا مرزا صاحب ؟"

مرزا صاحب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "یہی کہ مُرغی کی چوری ذرا چھپتی کم ہے اور عموماً بہت گراں ثابت ہوتی ہے ۔"

میں غور کرنے لگا کہ مرزا کے ایک موٹی کتاب گھسیٹ کر ماروں تو زیادہ موثر ہوگا یا روشنائی سے لبریز دوات ؟ کہ دفعتاً مرزا صاحب کے لڑکوں کے غول نے نعرہ لگایا "مل گئی للکی ! مل گئی للکی !"

مرزا صاحب ہڑبڑا کر باہر بھاگے اور میں اپنا توازن دماغی قائم رکھنے کے لیے اپنی عینک کے شیشے بلاضرورت صاف کرنے لگا ۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ غالباً اس حادثہ کے بعد مرزا حیدر بیگ کے تعلقات مجھ سے کچھ کشیدہ ہو گئے ہوں گے لیکن تو بہ کیجیے ! دوسرے روز میں اندر گھر میں داڑھی ہی بنا رہا تھا کہ مرزا صاحب نے ڈیوڑھی سے پکارا ۔ میں یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی تار آیا ہے منہ پر صابن لگائے اور ہاتھ میں اُسترا لیے ہوئے باہر نکل آیا ۔ مرزا صاحب نے ایک پُر جوش السلام علیکم کے بعد بڑے تحکمانہ لہجے میں استفسار فرمایا ۔

"یہ جھانسی میل کانپور سے کس وقت چھوٹتا ہے ؟"

"مجھے نہیں معلوم ۔"

"کیا کرایہ ہے لکھنؤ سے بھوپال کا ؟"

"مجھے نہیں معلوم ۔"

"تھرڈ کلاس میں بیٹھنے کی جگہ تو مل ہی جاتی ہوگی ؟"

"غالباً ۔"

"آج کل چھٹیوں میں واپسی ٹکٹ تو مل ہی رہا ہوگا ؟"

"شاید !"

"کہاں ملتا ہے یہ ٹکٹ اور کیا دام ہوتے ہیں اس کے ؟" وغیرہ وغیرہ ۔

میں نے اُسترا بند کر کے جیب میں ڈال لیا کہ کہیں مجھ سے کوئی حادثہ نہ سرزد ہو جائے صابن تو نہیں معلوم کب کا سوکھ کر چہرے کی خارشت ہو چکا تھا ۔

ایک گھنٹہ کی سر مغزنی کے بعد گھر واپس آیا تو بیگم نے بتایا کہ مرزا صاحب کی بیوی ابھی کہہ رہی تھیں کہ "بہن بڑے باتونی ہیں تمھارے میاں ۔ مرزا صاحب کو ایسا باتوں میں لگاتے ہیں کہ انھیں پھر گھر کی کوئی خبر ہی نہیں رہتی ۔"

# چمتکار

مانیہ بھوبوداس ریاست کے کھاد منتری، اس وقت ساری دنیا سے سخت بیزار بلکہ اس کو گولی مار دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ جب غصّے میں ہوتے تو اپنی بائیں مونچھ اینٹھنے لگتے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی اس حرکت کے باعث ان کی بائیں مونچھ داہنی مونچھ سے چھوٹی ہو گئی تھی اور کچھ لوگ یہ قیاس کرتے کہ ان کی بائیں مونچھ داہنی مونچھ سے پیدائشی چھوٹی تھی اور اس حرکت کی آڑ میں وہ اسے برابر کرنا چاہتے۔ بہر حال اس وقت وہ اتنے غصّے میں تھے کہ وہ اپنی بائیں مونچھ امیٹھ نہیں بلکہ باقاعدہ نوچ رہے تھے۔

وہ ابھی ابھی ایک دیہات سے نہر کی ایک پلیا کا ادگھاٹن کر کے لوٹے تھے لیکن دراصل آج خود ان کا ادگھاٹن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ گئے تو تھے وہ اس امید سے کہ وہاں باقاعدہ شامیانہ، جھنڈیاں، مان پتر، ہار، دعوت اور ان کی جے کارے لگاتا ہوا ایک بڑا مجمع ہوگا۔ لیکن وہاں کا عجیب ہی عالم تھا۔ ڈپٹی کمشنر، کپتان پولیس اور چند وہ مقامی نیتا جنھوں نے ان کو بڑے اصرار سے بلایا تھا۔ کچھ درختوں کی آڑ میں چوروں کی طرح چھپے کھڑے تھے اور قریب ایک درجن کانسٹبل تحصیل اور بلاک کے کچھ اہل کار اندازاً دو ہزار آدمیوں کے ہجوم کو جو کالے جھنڈے لیے کھاد منتری ہائے ہائے : "کھاد منتری واپس جاؤ" کے نعروں کی رٹ لگائے تھا، کبھی لاٹھیاں دکھا کر اور کبھی ہاتھوں کو جوڑ کر روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شامیانہ ایک طرف گرا پڑا تھا اور ڈائس کے پاس پھٹی کچھی جھنڈیاں اور ہار کسی عاشق جانباز کے مزار کا نقشا پیش کر رہے تھے۔ ایسے نازک موقع پر بھو بو داس کی موٹر کا نمودار ہونا بس غضب ہی تو ہو گیا۔ جیسے کسی نے جلتے پر تیل کیا پٹرول چھڑک دیا ہو۔ ہر قسم کے روک ٹوک کو توڑ کر ہجوم ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح اس پر جھپٹا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ڈرائور نے بڑی عجلت

سے موٹر موڑلی اور اسے لے کر الٹا بھاگا ورنہ بھوپو داس کے خیال میں آج ان کے سورگباش ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس پر بھی موٹر کے پیچھے اور چھت پر تڑاتڑ کئی ڈھیلے آکر گرے تھے اور بھوپو داس جو اپنی سیٹ پر اوندھے پڑے بڑی رقت انگیزی سے رام دھن گا رہے تھے مارے خوف کے ایک ایک بالشت اچھل پڑے تھے۔

جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدّھو گھر آئے' کے مصداق جب ان کی موٹر ان کی کوٹھی کے پورٹیکو میں آکر رکی تو وہ اپنے ہمراہ پرسنل اسسٹنٹ پر برس ہی تو پڑے۔

"یہ میلیا کا اُدگھاٹن تھا یا کسی پاگل خانے کا؟ آپ کلکٹر کا جواب طلب کیجیے۔"

"بہت اچھا حضور! کلکٹر نے کچھ روز پہلے لکھا تھا کہ وہاں کے لوگ سوکھا پڑ جانے کی وجہ سے بہت بے کل ہو رہے ہیں اور دو تین آدمی بھوک سے مر بھی چکے ہیں۔"

"جھوٹ سب جھوٹ! مجھے تو ایک بھی بھوکا دکھائی نہ دیا وہاں تو یوں کی طرح داغ رہے تھے نعرے اور پھینک رہے تھے ڈھیلے سب!"

"جی حضور!"

"اچھا تم کلکٹر سے کچھ نہ پوچھنا بلکہ اخباروں میں میری ایک تقریر جو مجھے وہاں کرنا چاہیے تھی چھپوا دو۔ یہی کہ اب کی پنج سالہ یوجنا میں سرکار وہاں کے لیے پانی کا انتظام کرنے والی ہے اور امریکہ سے اناج کا جہاز آتے ہی گانو گانو راشن کی دکانیں کھول دی جائیں گی۔ اور یہ بھی لکھ دینا کہ بہت شاندار سواگت اور ادگھاٹن رہا میرا۔" پاس ہی کھڑے ہوئے اردلی کو انھوں نے حکم دیا۔ "دیکھو میں آج کسی سے نہیں مل سکتا۔ میری طبیعت سست ہے۔"

اپنے کمرے کی تنہائی میں پہنچ کر مانیہ بھوپو داس ایک طرح سے انگاروں پر لوٹنے لگے۔ ادگھاٹن کی گڑبڑ تو ایک معمولی سی بات تھی۔ ایک پنساری سے منتری بن جانے کی لمبی سیاسی زندگی میں اُن پر ایسے یا اس قسم کے واقعات بیسیوں دفعہ بیت چکے تھے لیکن آج سویرے کابینہ کی بیٹھک کے سلسلے میں ان پر جو حادثہ گزرا تھا وہ اسے یاد کرتے تو کراہ کراہ اٹھتے۔ ان کی رائے میں آج کے دن کی ابتدا ہی بڑے بیہودہ طریقے سے ہوئی تھی۔

سویرے کابینہ کی بیٹھک ہونے والی تھی، اور چونکہ شرما جی مکھ منتری بیماری کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکے۔ لہذا قاعدے سے ان کی نیابت یعنی کابینہ کی صدارت کا حق بھوپو داس کو پہنچتا تھا۔ وہ سب منتریوں میں سب سے

زیادہ سینیر اور ساتھ ہی ساتھ موٹے بھی، مطلب یہ کہ رعب داب والے تھے۔ بھوپوداس سیاست کے میدان کے پرانے کھلاڑی اور دور کی کوڑی لانے والے گھاگ تھے۔ وہ اڑتی چڑیا کو پہچانتے اور ہوا کے بدلے ہوئے رخ کو کسی ماہر موسمیات سے پہلے سونگھ لیتے۔ وہ آج رسمی طور سے مکھ منتری کی نیابت کرنے کے پردے میں اپنے بہت پرانے خواب کی تعبیر کی پرچھائیں دیکھ رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ مکھ منتری کی گدی پر جھوٹ موٹ بھی پہنچ جائیں تو آیندہ کے لیے اس پر ان کا حق قائم ہو جائے گا۔ اور پھر کس کے منہہ میں دانت ہیں جو ان کے جیتے جی ان کو اس سے محروم رکھ سکتا ہے۔ ایسا غدر مچادیں کہ پارٹی میں وہ کیا اس کی پتولیں تک ہل جائیں گی۔ ان کے ہمدرد ایک بہت پہنچے ہوئے سیاسی لال بھکڑ نے ان کے کان میں پھونک رکھا تھا کہ موجودہ مکھ منتری کے خلاف کچھ سرکاری ٹھیکوں میں گول مال کرنے کے سلسلے میں جو انکوائری برسوں سے چل رہی ہے اس کی رپورٹ مرکزی سرکار کو پہنچ چکی ہے۔ وہ سولہ آنے شرما جی کے خلاف ہے اور مخالف پارٹی کے ممبران اس رپورٹ کو منظر عام پر لانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ پارٹی کا اعلا کمان چاہتا ہے کہ اس معاملے کو رفع دفع کرنے اور پارٹی کی بچی کھچی عزت بنائے رکھنے کے لیے شرما جی اپنے عہدے سے استعفا دے دیں اور ان کی اس قربانی کے انعام میں انھیں کسی ریاست کا راج پال بنا دیا جائے۔ عام لوگ اس ہونے والے ناٹک سے بالکل ہی بے خبر تھے لیکن بھوپوداس نے اس میں سوانگ بھرنے کے لیے بہت پہلے سے تیاری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے ابھی کچھ ہی دن پہلے اپنے محکمے کی سرگرمی میں ریاست بھر میں ایک 'چوہے مار ہفتہ' منوایا تھا، اور ریاست کی جنتا کو اپنی رائے میں ان کے آیندہ ہونے والے مکھ منتری سے اچھی طرح روشناس کرانے کے لیے ایک اشتہار میں ایک موٹے سے چوہے کے مقابل میں اپنی بھی تصویر چھپوا کر جس میں ان کی مونچھیں چوہے کی مونچھوں سے کچھ زیادہ ہی شاندار نظر آئیں ساری ریاست کے ایک ایک کوچے اور گلی میں چپکوا دیا تھا اشتہار کا عنوان تھا "ان کو مارو یہ خطرناک ہیں۔"

کابینہ کی بیٹھک کے وقت کا اعلان نو بجے کیا جاتا تھا۔ لیکن عام طور سے سب منتری دس بجے سے پہلے اکٹھا ہی نہ ہو پاتے۔ خود مکھ منتری کی گھڑی ہمیشہ کم سے کم ایک گھنٹہ سست رہتی۔ آج چونکہ بھوپوداس کو بیٹھک میں شرکت کے لیے زیادہ بے چینی تھی لہٰذا وہ تیار تو ساڑھے آٹھ بجے ہی ہو گئے تھے اور چاہتے تو

فوراً روانہ بھی ہو جاتے لیکن اپنی دور اندیشی کے ماتحت انھوں نے کچھ توقف کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگر وہ خلاف معمول وقت سے پہنچ جائیں گے تو اس سے کچھ اوچھا پن ظاہر ہوگا۔ لوگ سوچیں گے کہ وہ مکھ منتری کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے ضرورت سے زیادہ ہی بے چین ہیں۔

ان کا رویہ تو کچھ ایسا ہونا چاہیے جیسے وہ اس کے لیے نہیں بلکہ خود یہ کرسی ان کے لیے تڑپ رہی ہو۔ بات تو جب ہے کہ سارے منتری اور ان کے پیچھے ان کے سکریٹری اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوں اور صدر میں مکھ منتری کی کرسی ان کے انتظار میں کسی عاشق صادق کے آغوش کی طرح خالی پڑی ہو۔ وہ مسکراتے ہوئے کابینہ کے کمرے میں داخل ہوں تو سب اٹھ کر ان کی تعظیم کریں اور وہ اس متانت اور وقار کے ساتھ جیسے ریاست کی ساری پریشانیوں کا بوجھ وہ تنہا اپنے مضبوط کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کرسی کو کھینچ کر اس پر براجمان ہو جائیں۔

کابینہ کے کمرے میں اپنے بھاری بھرکم داخلے کے متعلق انھوں نے ایک کے بعد ایک جتنی بھی تصویریں اپنے ذہن کے پردے پر کھینچیں وہ شاندار سے شاندار تر ہوتی چلی گئیں۔ بھوپلو داس کا جی تو یہی چاہتا کہ وہ گھنٹوں بیٹھے یہی شغل جاری رکھیں اور اپنے اس جملہ حقوق محفوظ والے سنیما سے لطف اندوز ہوتے رہیں لیکن پھر وہ اپنی فطری بے چینی اور بوکھلاہٹ سے مجبور ہو گئے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دس بجے سے پہلے پہنچنا قبل از وقت ہوگا۔ وہ ساڑے نو بجے اپنی موٹر پر کونسل ہاؤس کے لیے روانہ ہو گئے۔ کونسل ہاؤس پہنچ کر وہ لپکتے جھپکتے کابینہ کی بیٹھک کے کمرے کی طرف بڑھے تو سیڑھیوں کے پاس برآمدے میں انھیں دیوودت مسرا اور شیخ چراغ اللہ باتیں کرتے ہوئے مل گئے۔ بھوپلو داس ان دونوں کو اپنا خاص آدمی سمجھتے لیکن اس وقت ان دونوں کے سلام کرنے اور پھر مسکرانے کے انداز میں انھیں کچھ ملی بھگت کی بو سونگھ پڑی (سیاست میں دیکھنے اور سننے سے کہیں زیادہ ضرورت سونگھنے کی ہوا کرتی ہے) لیکن اس کو نظر انداز کر کے وہ پکارے "میٹنگ میں نہیں چلیے گا؟" اس پر شیخ چراغ اللہ نے پان کی پیک بھرے مُنھ سے کچھ ایسا غوں غوں جواب دیا کہ سمجھ میں نہیں آیا البتہ ان کے ہاتھ ہلانے کے انداز سے ایسا پتا چلا جیسے "تو چل میں آیا والا مضمون ہے۔"

بھوپلو داس آگے بڑھے تو کابینہ کی بیٹھک کے کمرے کی طرف سے قریب

قریب سارے منتری جس میں لالہ چھجو مل سب سے آگے تھے آتے ہوئے ملے ان کا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے لیکن انھوں نے نمستے کے لیے ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے پوچھا، کیا آج بیٹھک کا ارادہ نہیں ہے؟"

"ہو بھی چکی بیٹھک، نو بجے کا وقت تھا اور اب تو دس بجنے والے ہیں بڑھاپے میں سویرے ذرا جلدی اٹھنا مشکل ہی ہوتا ہے" بھاشکر بابو نے جو لالہ چھجو مل کی ناک کے بال تھے چبا چبا کر کہا۔ ان کے آخری جملے پر کئی منتری مسکرا دیے۔

بھوپو داس پر بجلی سی گری لیکن سیاست کے داؤ پیچ سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ جانتے کہ سیاست میں کوئی شخص اس وقت تک ہار ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ خود اپنی ہار نہ مان لے۔ لہٰذا زہر کا گھونٹ پی کر بھی ہنستے ہوئے بولے "اجی ان پرانے چاولوں کی قدر آپ کیا جائیں؟ وقت پڑنے پر بڑا کام دیتے ہیں یہ!"

"اجی قحط میں پرانے کیا نئے چاول بھی غنیمت ہوتے ہیں" لالہ چھجو مل نے کہا۔ لیکن بھوپو داس سُنی ان سُنی کر کے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ بڑھاپے والی چوٹ سے وہ اور بھی تلملا اٹھے تھے۔ ادھر چند ہفتوں سے وہ کابینہ کے لیے پرانے خون اور نئے خون کی کچھ باتیں سن رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں اس کے متعلق کچھ نہیں آیا تھا خود ان کی عمر قریب اڑسٹھ سال کی تھی لیکن وہ اپنے خون میں کسی قسم کی بوسیدگی محسوس نہ کرتے۔ ان کے دشمن ان کو کابینہ سے نکالنے کے لیے اس قسم کی ہوائیاں اکثر اڑاتے رہتے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر انھوں نے اپنے اردلی کو حکم دیا کہ وہ فوراً ان کے سکریٹری کو بلا لائے۔

بھیگی بلی بنا سکریٹری آیا تو بھوپو داس اس پر خونخوار دوڑے "کس وقت شروع ہوئی میٹنگ؟"

"نو بجے"

"صدارت کس نے کی؟"

"لالہ چھجو مل نے"

"کس نے پیش کیا تھا ان کا نام؟"

"بھاشکر بابو نے"

"معاملہ میرے محکمے کا تھا۔ مرکزی سرکار کو ریاست کے غلہ کی مانگ کا بیورا بھیجا جانے والا تھا اور میٹنگ میرے بغیر شروع کر دی گئی۔ آپ نے کاغذات کیوں

پیش کیے ؟"

"مجھ سے کوئی کاغذات مانگے ہی نہیں گئے ۔ زبانی یہ پرستاؤ پاس کر دیا گیا کہ چونکہ مکھ منتری بیمار ہیں لہٰذا ان کے نائب کی حیثیت سے لالہ پھول فوراً بذریعہ ہوائی جہاز دہلی جائیں اور مرکزی سرکار کو قحط سالی کی صورت حال بتا کر ریاست کے لیے زیادہ سے زیادہ غلّہ الاٹ کرانے کی کوشش کریں۔"

بھوپو داس کو چکر سا آگیا لیکن انھوں نے بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا "قحط سالی کی کانفیڈنشل فائل آپ فوراً میرے پاس لے آیئے۔"

اور پھر جیسے ہی سکریٹری نے ان کو فائل لاکر دی انھوں نے اس کو اپنے ڈسک کے ڈبل لاک میں بند کر دیا اور اس کی کنجیاں اپنی صدری کی اندرونی جیب میں رکھ لیں ۔ ایک ہلکی سی ایسی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی جیسے کسی بھوکی بلّی نے کوئی مسلّم چوہا نگل کر اطمینان کی سانس لی ہو۔

بھوپو داس کی الجھن اور گھبراہٹ دیکھ کر ان کی شریمتی جی کے بھی ہاتھ پانو پھول گئے ۔ انھوں نے جلدی سے انھیں ہلکا پھلکا کھانا کھلایا اور جلد سو جانے کا مشورہ دیا۔

رات کو گیارہ بج چکے تھے اور بھوپو داس اگر سو نہیں تو جاگ بھی نہیں رہے تھے ۔ دفعتاً ان کے سرہانے رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔ یہ ٹیلیفون ان کا خفیہ تھا اور اس کا نمبر سوائے ان کے پرسنل اسسٹنٹ اور چند مخصوص دوستوں کے اور کسی کو معلوم نہیں تھا ۔ انھوں نے ہڑبڑا کر ٹیلیفون کا چونگا اٹھالیا۔

"ہیلو ! میں ہوں بھوپو داس کھاد منتری ۔ آپ کون صاحب ہیں ؟"

"میں ہوں تواری ۔ شرما جی مکھ منتری کا ابھی دس بج کر گیارہ منٹ پر راج کوٹلا کے ڈاک بنگلے میں دیہانت ہو گیا ۔ میں چاندنگر سے فون کر رہا ہوں۔"

"شرما جی کا دیہانت ہو گیا ؟" بھوپو داس کے بجلی کا کرنٹ سا لگ گیا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

"جی ہاں جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا وہ آج تین روز ہوئے بحالیِ صحت کے لیے راج کوٹلا آئے ہوئے تھے ۔ ان کے ساتھ مسز اُن کے ڈاکٹر بھی تھے ۔ نو بجے وہ سونے کے لیے لیٹے ، دس بجے انھیں ایک ڈکار آئی اور چند ہی منٹ میں وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ۔ مرنے سے چند منٹ پہلے انھوں نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے بھی کہا تھا ۔"

"ظاہر ہے کہ وہ اپنے بعد مجھ کو ہی مکھ منتری بنانا چاہتے۔ بڑے ہی سمجھدار اور دور اندیش نیتا تھے وہ۔ اچھا تو میں راج گوٹلا کے لیے فوراً روانہ ہو رہا ہوں۔"

"جی نہیں آپ وہاں کے انتظام کیجیے ہم لوگ شرما جی کی مٹی لے کر سات بجے سویرے پہنچ رہے ہیں۔ لال چوکی کے میدان میں آپ لوگ مل جایئے گا۔"

بھوپوداس جن کے ہوش و حواس اب پورے طور سے بیدار ہو چکے تھے کافی زور سے چیخے "دیکھیے آپ نے مجھے اطلاع دیدی ہے اب آپ کو کسی دوسرے کو اطلاع دینے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں پرماتما کی دیا سے سب انتظام ٹھیک کر لوں گا۔"

اور اس کے بعد بھوپوداس نے نہ صرف رات بھر پلک نہیں جھپکائی بلکہ زمین آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دیے۔ راج پال کو اپنا پرسنل اسسٹنٹ بھیج کر اطلاع، کابینہ کے منتریوں، چیف سکریٹری اور صوبے کے سارے اعلا افسران کو ٹیلیفون، اخبار نویسوں کو بیانات، صوبے بھر میں تین روز سوگ منانے کے لیے چھٹی کا اعلان، تمام سرکاری عمارتوں پر جھنڈوں کے سرنگوں کر دیے جانے کا حکم، چیف سکریٹری اور پولیس کے اعلا افسران سے مشورے کے بعد جنازے کے جلوس کے راستے کی تجویز، فوجی گاڑی اور بینڈ کا انتظام، سورگ گھاٹ پر انتم سنسکار کا پورا پربندھ وغیرہ وغیرہ مکھ منتری کے اچانک دیہانت سے بھوپوداس سب سے سینیر منتری ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ان کا قدرتی جانشین سمجھنے لگے تھے۔ وہ چاہتے کہ یہ پد سنبھالتے ہی وہ جو پہلا کام کریں وہ ان کا چمتکار ثابت ہو اور ان کے دوستوں اور دشمنوں پر یکساں طور سے ان کی سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت کی ایسی دھاک بیٹھ جائے کہ پھر ان کے علاوہ کسی دوسرے کا نام بحیثیت پارٹی لیڈر پیش کرنے کی کسی میں ہمت ہی نہ رہے۔

معمولی سے معمولی جزئیات تک پر بھی بھوپوداس کی دوررس نظریں دیکھ کر اعلا سے اعلا افسران تک عش عش کر گئے۔ رات کے تین بجے سے سارے شہر کو لاؤڈ اسپیکروں نے سر پر اٹھا لیا۔ مکھ منتری کے اچانک دیہانت کی خبر کے ساتھ ساتھ مانیہ بھوپوداس کی طرف سے جنتا کو نویدن تھا کہ وہ سویرے چھ بجے ہی شہر سے باہر لال چوکی کے میدان میں اپنے سورگباشی مکھ منتری کے انتم درشنوں کے لیے جمع ہو جائیں۔

رات بھر جاگنے اور سر مغزنی کرنے سے بھوپوداس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں

اور وہ ان پر بار بار رومال رکھ کر یہ ظاہر کرنا چاہتے کہ یہ مسلسل آہ وزاری کا نتیجہ ہے۔ بازو پر ایک بڑا سیاہ بلاّ لگائے وہ ساڑھے چھ بجے لال چوکی کے میدان میں پہنچے۔ تو پندرہ ہزار کے مجمع نے "شرما جی امر ہو گئے" کے ساتھ ہی ساتھ "بھوپوداس زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ فخر اور خوشی کے مارے بھوپوداس کا سینہ کئی انچ پھول گیا لیکن موٹر سے اترتے وقت انھوں نے مصلحتاً اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور تھوڑی سی کمر بھی جھکا لی جیسے وہ مارے غم کے نڈھال ہوئے جا رہے ہوں مجمع کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے ان کے "زندہ باد" کے دو چار نعرے غم سے بوجھل فضا میں اور جھونک دیے۔ بھوپوداس کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا منتری موقع پر نظر نہ آیا اور وہ دل ہی دل میں مسکرائے کہ اس ساری کارگزاری کا سہرا صرف انھیں کے سر رہے گا۔ انھیں بوڑھا کہنے والوں کو آج منہ کی کھانا پڑے گی۔ ان کے خلاف بہت چبا چبا کے باتیں بنانے والے اب اپنے گریبانوں میں سر چھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

سات بجے راج کوٹلا کی طرف سے مکھ منتری کی موٹر اور اس کے پیچھے ایک اسٹیشن ویگن آتی دکھائی دی۔ فوجی سپاہی، پولیس کانسٹبل اور سب افسران اپنی اپنی جگہوں پر چوکنا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بینڈ نے دھیمے سروں میں ماتمی دھن بجانا شروع کر دی۔ مجمع میں کھلبلی مچ گئی اور اس نے بڑے والہانہ انداز میں "شرما جی امر ہو گئے" کے نعرے لگانا شروع کر دیے اور بے اختیار آگے کی طرف جھپٹا۔ اس کو قابو میں رکھنے کے لیے امدادی پولیس کو تھوڑا سا لاٹھی چارج بھی کرنا پڑا۔ ایک بڑے سے فوجی دستے نے الٹے ہتھیاروں کے ساتھ دو سمتوں سے پیش قدمی کی اور موٹروں کے یکے بعد دیگرے رکتے ہی بڑے ضبط و نظم کے ساتھ سلامی دی۔

آنے والی پہلی موٹر میں سے ایک بہت ہی متعجب اور حیرت زدہ منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے ریاست کے مکھ منتری شرما جی جلدی سے اتر کر سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔

# شرما جی کا امتحان

مکندی لال شرما نے اپنی ساری زندگی تحصیل علم بلکہ تحصیل علم کے متعلق نئے نئے تجربات کرنے کے لیے وقف کردی تھی۔ جس ڈگری کالج میں وہ زیر تعلیم تھے وہاں انھیں اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ اب بہت سے لوگوں کو یہ بھی نہیں یاد تھا کہ کالج کا سنگِ بنیاد پہلے رکھا گیا تھا یا شرما جی نے اس میں داخلہ پہلے لیا تھا بلکہ کچھ لوگ جو غلط مبحث کے عادی تھے یہ بھی سمجھتے تھے کہ کالج کا سنگِ بنیاد شرما جی ہی نے رکھا تھا۔

پرنسپل یا کسی پروفیسر کو کالج کے متعلق بہت پرانی بات دریافت کرنا ہوتی تو وہ شرما جی ہی سے پوچھی جاتی مثلاً اگر کسی کو معلوم کرنا ہوتا کہ کالج کا گھنٹہ گھر کب بنا تو وہ کالج کے بہت پرانے دیمک زدہ کاغذات سے سر مغزنی کرنے کے بجائے شرما جی سے پوچھ لیتا اور وہ بلا تکلف بتا دیتے کہ فلاں سن میں جب مسٹر چترجی پرنسپل تھے تب گھنٹہ گھر کی عمارت بننا شروع ہوئی اور اس کے دو سال بعد جب مسٹر لیکر پرنسپل ہوئے تب اس میں گھڑی لگی تھی۔ لائبریری کی عمارت اس سے ایک سال پہلے تعمیر ہو چکی تھی۔ اور سائنس ڈیپارٹمنٹ کا بایاں بازو اس کے دو سال بعد بنا تھا جس کا سنگِ بنیاد گھمنڈی داس وزیر تعلیم نے رکھا تھا۔ اور گھنٹہ گھر کی گھڑی جب پہلے پہل غلط وقت دیتی تھی تو اس کے خلاف شرما جی نے کالج کی تاریخ میں جو سب سے پہلی ہڑتال کرائی تھی وہ ضرورت سے زیادہ کامیاب رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔

ماہرینِ تعلیم تو اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارا نصابِ تعلیم بہت ناقص اور ناکارہ ہے۔ لیکن ہمارے شرما جی اس نتیجے پر اب سے ایک چوتھائی صدی قبل پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جولانیِ طبع کے لیے نصاب تعلیم کے تنگ و تاریک میدان کے بجائے دوسرے روشن اور پُر فضا میدان منتخب کیے تھے۔ مثلاً

الکشن، ہڑتال، مرن برت، جلوس، جلسہ، ڈراما، مشاعرہ، فینسی ڈریس، سینما غل غپ گپ شپ، وغیرہ وغیرہ اور ان میدانوں سے انھوں نے جو تجربات اور پختہ کاری حاصل کی تھی وہ محدود نصاب تعلیم سے سات جنم میں بھی نہیں سیکھ سکتے تھے۔

میدان کا کوئی کھیل شرما جی نے کبھی نہیں کھیلا تھا لیکن کالج کی ہر ٹیم میں بارھواں نام شرما جی کا ضرور رکھا جاتا۔ شرما جی کے ساتھ کالج کی ٹیم جہاں بھی جاتی وہاں ٹورنامنٹ کے منتظمین سے یا ریفری اور ایمپائر سے یا مخالف ٹیم سے کوئی جھگڑا اور فساد ضرور ہو جاتا اور ایسی صورت میں موقع واردات پر شرما جی کی موجودگی اور ریشہ دوانی ٹیم کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوتی۔ یہ جھگڑے اور فساد زیادہ بڑھے تو ذمہ داران کالج نے ٹیم کا باہر بھیجنا موقوف کر دیا لیکن پھر جب یہ جھگڑے اور فساد زیادہ مہلک صورت میں خود کالج میں رونما ہونا شروع ہو گئے تو ذمہ داران کالج کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی اور وہ شرما جی کی سرکردگی میں کالج ٹیم کو زیادہ سے زیادہ تر کالج سے باہر ہی رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

کالج کے ہر اس عہدے پر جس پر کہ کوئی طالب علم منتخب ہو سکتا تھا شرما جی دو دو تین تین مرتبہ فائز ہو چکنے کے بعد اب خود الکشن لڑنے سے تائب ہو چکے تھے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ وہ کسی سنگین انتخابی بدعنوانی کی پاداش میں کسی بھی انتخاب میں امیدوار ہونے سے دائمی طور پر محروم کیے جا چکے تھے۔ لیکن بہرحال الکشن لڑوانا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور جس امیدوار کی امداد پر وہ کمر بستہ ہو جاتے وہ نوے فی صد ضرور جیت جاتا ورنہ الکشن میں ٹنٹا ڈگی اور بلوہ ہو جاتا اور پھر ہڑتالیں شروع ہو جاتیں اور بالآخر پچھلا الکشن رد کر دیا جاتا اور نیا الکشن شروع ہو جاتا۔ فن الکشن بازی میں انھیں وہ مہارت تامہ حاصل تھی کہ اکثر دوسرے کالجوں کے الکشن کے موقعوں پر ان کی خدمات معقول معاوضوں پر بھی حاصل کی جاتیں۔ ایک دفعہ کسی کالج کے طلبہ نے ایک مرن برت کے لیے شرما جی کی خدمت یومیہ کرائے پر بھی حاصل کی تھیں! خود اپنے کالج میں بات بات پر اسٹرائک کرا دینا یا مرن برت رکھا دینا یا رکھ ڈالنا شرما جی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کالج کے اساتذہ ان کی صورت دیکھ کر کانپتے تھے۔ چنانچہ بظاہر وہ ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرتے لیکن دل ہی دل میں فریاد کرتے کہ یا خداوندا وہ مبارک اور مسعود دن کب آئے گا جب اس بلائے بے درماں یعنی اس شرما کے بچے سے کالج پاک ہو جائے گا۔

شرما جی ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ سات آٹھ مرتبہ کالج سے نکالے جا چکے تھے۔ لیکن

اس سے کالج میں اسٹرائک، ہڑتال، مرن برت ہائے ہائے اور انقلاب زندہ باد کی وہ آندھیاں اور طوفان اٹھتے کہ کالج کی بنیادیں متزلزل ہو جاتیں اور آدم کے جنت سے نکالے جانے کا ہنگامہ ایک داستانِ پارینہ معلوم ہونے لگتا۔ بہت جلد نکالنے والوں کو خود اپنے نکالے جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا اور وہ شرماجی کو واپس بلا کر ان کی خوشامد کرنا شروع کر دیتے۔

شرماجی کالج کے انتظامی مسائل میں کچھ اس طرح الجھے رہتے کہ انھیں کورس کی کتابوں پر توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا، بلکہ اکثر چونکہ کورس کی نئی کتابیں ان کے مشورے کے بغیر تبدیل کر دی جاتیں لہٰذا وہ ان کے ناموں سے بھی غیر مانوس رہتے لیکن اس کے باوجود اگر دنیا میں واقعی صحیح قدر شناسی ہوتی تو وہ بی، اے (فائنل) میں سات سال فیل کیے جانے کے بجائے خود اپنے کالج کے پرنسپل ضرور بنا دیے گئے ہوتے۔

قدرت کو بھی شاید یہی منظور تھا کہ شرماجی ایک سدا بہار طالب علم بنے رہیں اپنے ہلکے پھلکے چھوٹے ڈیل ڈول، بڑی بڑی معصوم آنکھوں اور داڑھی مونچھوں سے مستغنی چہرے کی بنا پر انھوں نے کچھ ایسا حلیہ پایا تھا کہ ان کی عمر پچیس سال سے پینتالیس سال کے اندر کچھ بھی بتائی جا سکتی اور خواہ وہ اپنے سابق ہم جماعت استادوں کے ساتھ ہوں اور خواہ وہ اپنے ان نوخیز ہم جماعت بچوں کے ساتھ ہوں کہ جن کے والد بھی ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے وہ کہیں بے جوڑ یا بے تکے نہیں معلوم ہوتے۔

یوں تو شرماجی بڑے پُر جوش، ہنگامہ خیز اور باغ و بہار طبیعت کے انسان تھے لیکن ان کی وضع قطع انتہائی سادہ اور بے تکلف تھی، ہمیشہ کھدر کا کرتا پاجامہ اور چپل پہنتے۔ سردیاں ہوتیں تو اس لباس میں ایک بنڈی کا اضافہ کر لیتے۔ نہ انھوں نے کبھی ٹوپی پہنی اور نہ کبھی اپنے بڑے بڑے پریشان بالوں کو تیل یا کنگھے کا شرمندۂ احسان کیا۔ البتہ جب وہ کوئی فلسفیانہ گفتگو کرتے تو اپنی پتلی نازک انگلیوں سے اپنے بال اوپر کھینچ کر ان میں کچھ ضبط و نظم پیدا کر لیتے۔ کھانے کے معاملے میں شرماجی انتہائی آزاد خیال، بدپرہیز اور گڑبڑ جھالا قسم کے انسان واقع ہوئے تھے۔ پان کھانے کے وہ بڑے شوقین تھے اور غالباً اس سے بھی زیادہ پیک تھوکنے کے لیکن زندگی کا بہت بڑا حصہ اس کام میں صرف کرنے کے باوجود اس میں بڑے ناتجربہ کار تھے۔ پیک کے دھبوں سے داغدار کپڑوں میں وہ ہمیشہ ایک لالہ زار بنے رہتے۔

شرماجی نے آزاد خیالی، زندہ دلی اور بے راہ روی کی بڑی منزلیں طے

کی تھیں لیکن انھوں نے کبھی کوچہ عشق میں اپنے نام کا پتھر لگوانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مطلب یہ کہ اس سلسلے میں مصری کی مکھی بھلے ہی بنے ہوں کبھی شہد کی مکھی نہیں بنے تھے۔ وہ ہر عورت کا بڑا احترام کرتے اور کالج میں پڑھنے والی لڑکیوں کو تو وہ اپنی سگی بہنوں سے کم نہ سمجھتے اور ان سب کے بلا شرکت غیر خود ساختہ سرپرست بنے رہتے ہر لڑکی کو ان کی نیک نیتی پر پورا اعتماد تھا۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کی ہر چلائی ہوئی تحریک میں یہ لڑکیاں نمایاں حصہ لیتیں اور ان کو پیار سے شرما جی کے بجائے شرما بھائی کہا کرتیں۔ دراصل نہ تو شرما جی ضرورت سے زیادہ شریف النفس تھے اور نہ ان کے فطری تقاضے ہی کند تھے بلکہ وہ عورتوں کے معاملے میں کچھ پیدائشی جھینپو واقع ہوئے تھے اور مردوں کے مقابلے کا یہ شیر کسی عورت کو دیکھتے ہی بھیگی بلی بن جایا کرتا۔

شرما جی مجھ پر خاص طور سے مہربان تھے اور مجھ سے ہمیشہ انتہائی محبت خلوص اور بے تکلّفی سے ملتے تھے۔ سچ پوچھیے تو ان کی یہ دوستی مجھے ورثے میں ملی تھی۔ شرما جی کسی پرائمری اسکول میں نہ صرف والد صاحب کے ہم جماعت بلکہ خاص دوستوں میں تھے اور اگرچہ مدّت ہوئی ان دونوں کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ (والد صاحب بیس سال سے وکالت کر رہے تھے) لیکن دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ شرما جی یوں تو مجھ سے بحیثیت ایک دوست کے ملتے لیکن جب انھیں مجھ پر کوئی خاص حکم چلانا مقصود ہوتا تو فوراً چچا بن جاتے اور ڈپٹ کر فرماتے۔

کیوں بے بھتیجے! اپنے حقیقی چچا سے یہ نافرمانی۔۔؟ ؎

کبھی ہم چچا تھے جو اپنے چچا کے۔ بھتیجے ہمارے چچا ہو رہے ہیں۔ اور میں اپنے حقیقی چچا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جاتا مجھے بھی جب ان سے کوئی خاص کام لینا مقصود ہوتا تو میں ان کو میرا چچا ہونا یاد دلا دیتا اور وہ لاجواب ہو جاتے۔

ایک مرتبہ دسمبر کی بڑی چھٹیوں کے بعد شام کو گھر سے ہاسٹل واپس آیا اور اپنے کمرے میں اسباب رکھنے کے بعد فوراً شرما جی کے کمرے پر سلام کرنے پہنچا تو دیکھا کہ دروازے میں قفل پڑا ہوا ہے۔ لیکن اندر بجلی جل رہی ہے۔ ایک دروازے سے جھانکا تو دیکھا کہ فرش پر بہت سی کتابوں کے درمیان شرما جی اکڑوں بیٹھے ہوئے کچھ بڑبڑا رہے ہیں۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو زور سے گرجے۔

پڑھ رہا ہوں ڈسٹرب مت کرو۔ میں نے کہا "میں ہوں آپ کا بھتیجا!" شرما جی کا دل فوراً پسیج گیا اور انھوں نے دوسرا دروازہ جو اندر سے بند تھا۔ کھول دیا۔ میں نے کہا "چچا یہ کیا؟" کہنے لگے "ایک دروازہ باہر سے مقفل کر دیتا ہوں اور دوسرا اندر سے بند

کر لیتا ہوں تاکہ پڑھائی میں کوئی مخل نہ ہو سکے۔"
میں نے کہا " پڑھائی ؟ یہ پڑھائی کی بد پرہیزی آپ نے کب سے شروع کر دی؟ نصیبِ دشمناں یہ مرض اس سے پہلے تو آپ کو کبھی لاحق نہیں ہوا تھا؟ آپ تو چھپے رستم نکلے!"
ہنسنے لگے" کچھ نہیں یونہی! سوچا اس سال کچھ پڑھ ہی ڈالوں امتحان تو بہرحال کبھی نہ کبھی پاس کرنا ہی ہے!"
شرماجی کے کمرے کا جغرافیہ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ کرسی، میز اور پلنگ کمرے میں ایک طرف کنارے دیوار سے کچھ اس طرح لگا دیے گئے تھے جیسے وہ ناقابلِ استعمال ہو چکے ہوں۔ بیچ کمرے میں چٹائی پر دری کا فرش تھا اور اس پر ہر طرف کتابوں اور کاپیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جاسوسی ناولیں اور فلمی رسالے جو عالم طور سے شرماجی کے زیرِ مطالعہ رہتے اور جن کا ہاسٹل بھر کا ذخیرہ ان کے پاس جمع رہتا، ستلی سے بندھے ہوئے دو بڑے بڑے بنڈلوں میں منتقل ہو کر میز کے نیچے کچھ اس انداز سے رکھے ہوئے تھے جیسے پنساری کی دُکان پر جانے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں۔ کمرے کے شوخ اور طرح دار کلنڈر بھی غالباً انھیں بنڈلوں میں باندھے جا چکے تھے۔ اور دیواروں پر صرف ایک کرشن جی کی تصویر باقی رہ گئی تھی جس میں وہ ایک ایسے والہانہ انداز سے بانسری بجا رہے تھے کہ اس کی آواز کانوں کو نہیں بلکہ دل کو محسوس ہوتی۔ دیوار میں بنی ہوئی الماری پر خلاف توقع ایک تیل کی شیشی ایک آئینہ اور کنگھا بھی نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں سابقہ بدنظمیوں اور افراتفری کا کوئی نشان نہیں تھا۔ کپڑے، چپل، لوٹا، مسواک اور دوسری چیزیں اپنی مناسب جگہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ البتہ کتابوں اور کاپیوں کے طوماروں سے کمرے کا فرش ایک میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ میں نے اس سارے منظر کو دیکھا اور اس کے امکانات ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تو مبہوت رہ گیا۔
" شرماجی یہ انقلاب عظیم کیسے اور کیوں؟ کیا اس مرتبہ کالج کے نوخیز بچوں کو یتیم کر جانے کا ارادہ ہے؟" ہم دونوں فرش پر کتابوں کے اوپر بیٹھ گئے تھے۔
" بھائی تم سے کیا چوری" شرماجی نے بڑی محجوبیت سے کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے کوئی اقبال جرم کر رہے ہوں۔" میرا ارادہ ہے کہ اس سال پاس ہی کر ڈالوں بی، اے۔"
" لیکن یہ کیوں؟ امتحان پاس کرنے کے آپ کیسے قائل ہو گئے۔ ؟ آپ ان تکلفات میں پڑتے تو آج سے پچیس برس قبل ہی گریجوٹ ہو چکے ہوتے! اور بی، اے فائنل میں تو

ابھی آپ کو کچھ ایسا زمانہ بھی نہیں گزرا ہے !

"آج سویرے ہی حساب لگایا تھا، یہ آٹھواں سال ہے"، اور یہ کہتے ہوئے شرما جی نے کتابوں کے نیچے سے نکال کر مجھے ایک چارٹ دکھایا جس میں بہت تفصیل کے ساتھ درج تھا کہ ڈگری لینے کے لیے انھوں نے یونی ورسٹی پر اب تک جو سات حملے کیے تھے ان میں وہ کس کس انداز سے ناکامیاب رہے تھے۔ تین مرتبہ تو وہ حاضری پوری نہ ہونے مرن برت رکھنے اور اسٹرائک میں حصہ لینے کے باعث امتحان میں شریک ہی نہیں کیے جا سکے تھے اور چار مرتبہ وہ مختلف مضامین میں مختلف طریقوں سے کھیت رہے تھے۔

میں نے کہا "ابھی تو اس چارٹ میں بڑی گنجایشیں باقی ہیں۔ آپ تین مرتبہ بے ضابطہ اور صرف چار مرتبہ بے ساختہ فیل ہوئے ہیں۔ ابھی آپ تاریخ اور فلسفے میں علاحدہ علاحدہ اور انگریزی اور فلسفے میں ایک ساتھ فیل نہیں ہوئے ہیں۔۔۔"

شرما جی نے میری بات کاٹ کر کہا "چہکتے ہی چلے جاؤگے بھتیجے یا اپنے چچا کی بھی سنوگے ! بات اصل یہ ہے کہ اب کی میرا پاس ہونا حد سے زیادہ ضروری ہے جو اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے ! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے ! اور ہاں مجھے اپنے ایک انتہائی ذاتی اور اہم معاملے میں تم سے مشورہ بھی کرنا ہے لیکن خبردار اس کا ذکر کسی دوسرے سے نہ کرنا۔"

شرما جی کا رازدارانہ لہجہ دیکھ کر مجھے بھی سنجیدہ بننا پڑا۔

"چچا آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ آپ کی بات اور نکل جائے اور میرے منھ سے ؟ آپ کے بہت پرانے اور مخلص دوست کا بیٹا ہوں یا کوئی اور ؟

"خیر تمھارے باپ تو پیٹ کے بہت ہلکے تھے اور ایک دفعہ اپنی چغل خوری سے مجھے ایک مولوی صاحب سے پٹوا یا بھی تھا۔ لیکن مجھے تمھارے کردار پر اعتماد ہے۔ تم مس اوشا بخشی کو جانتے ہو ؟"

"ارے وہی بڑ دتی جس کے چہرے پر دو چار چیچک کے داغ بھی ہیں سوکھی چمرخ !"

شرما جی بڑے غضبناک لہجے میں بولے "بس ! بس ! آج کل کے لونڈے صرف لپے پُتے چہروں کو حسین سمجھتے ہیں ! ظاہرداری پر مری جارہی ہے دنیا ! چشم بصیرت ہا حسنِ صورت نہیں، حسنِ سیرت دیکھتی ہے۔"

"واقعی حسنِ سیرت میں تو اوشا بخشی آپ اپنا جواب ہے ! میں نے ایسی پاکیزہ

سنجیدہ اور سلیم الطبع لڑکی تو اپنی زندگی میں دیکھی ہی نہیں" مجھے بہرحال شرما جی کو تو ٹھنڈا ہی کرنا تھا۔"
" بالکل ٹھیک! ہاں تو جب میں پچھلی مرتبہ مرن برت رکھ رہا تھا تو اس نے بڑی ہمدردی کی تھی میرے ساتھ۔"
" یعنی؟" میں نے پوچھا۔
" یعنی روز شام کو وہ کھانا لے آتی تھی میرے لیے! شام کو جب مجھے دیکھنے آتی تو کھانے کی ایک پوٹلی میرے سرہانے رکھ جایا کرتی!"
" اچھا اسی وجہ سے مرن برت کے دوران آپ کا وزن گھٹنے کے بجائے کچھ بڑھ گیا تھا۔"
" فضول بکواس مت کرو۔ ہاں تو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ہے اور ہم لوگوں نے قسم کھائی ہے کہ اگر پنڈت نردوش نرائن بخشی یعنی اوشا کے والد راضی ہو جائیں گے تو ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جائیں گے۔ چنانچہ میں پنڈت نردوش نرائن بخشی کے پاس پہنچا بلکہ ہر دوسرے روز پہنچنے لگا۔ لیکن اپنی درخواست پیش کرنے کا مجھے کوئی موقع ہی نہ ملتا۔ اور ادھر اوشا جلدی کر رہی تھی خیر ایک روز جب میں بخشی جی کے یہاں پہنچا تو وہ بڑے غصے میں بید لیے اپنے کتے کو مار رہے تھے اور تم جانتے ہو کہ میں کوئی ظلم اپنی آنکھوں کے سامنے برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے جاتے ہی ان کا بید پکڑ لیا۔ انھوں نے گرج کر کہا "ابے تو کون ہے جو آئے دن میرے یہاں اپنی منحوس صورت لے کر آیا کرتا ہے۔ چھوڑ میرا بید!" میں نے یہی موقع غنیمت سمجھا اور فوراً کہہ دیا کہ میں آپ کی لخت جگر اوشا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔! پھر کیا ہوا؟ خیر تفصیلات تو بہت ہیں انھیں جانے دو۔"
تھوڑی دیر دم لینے کے بعد شرما جی پھر گویا ہوئے۔ بخشی جی بلکہ ان کے ملازمین مجھے ان کے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور شام سے رات کے ڈھائی بجے تک مجھ سے اور بخشی جی سے مختلف موضوعات مثلاً شادی، طلاق، ایٹم بم، خالصتان جنسی مساوات اور عورت کی اقتصادی آزادی وغیرہ وغیرہ پر بحث ہوتی رہی۔ تم جانتے ہو کہ میری زبان جب ایک دفعہ کھل جاتی ہے تو پھر بند ہونے کا نام نہیں لیتی۔ قصہ مختصر میری درخواست پر بخشی جی نے اپنا آخری اور حتمی فیصلہ یہ سنایا کہ اگر اس سال میں بی۔ اے پاس کر لوں تو وہ نتیجہ نکلنے کے پندرھویں دن اوشا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر مجھے دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان بنا دیں گے ورنہ اگر اس کے بعد پھر کبھی میں نے ان کی کوٹھی کے احاطے میں قدم رکھا تو۔۔۔۔۔۔۔ خیر

تفصیلات غیر ضروری ہیں ۔ میں نے مودّبانہ احتجاج کیا کہ جب میں اور اوشا دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو یہ "جوئے شیر" والی شرط لگانے سے کیا حاصل؟ بخشی جی نے بڑے جوش میں جواب دیا۔

"میری لڑکی اس سال قطعاً بی اے پاس ہو جائے گی۔ اور میں ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا داماد میری لڑکی سے کم تعلیم یافتہ ہو۔ اور ہاں چونکہ میں ریٹائرڈ جج ہوں لہذا اگرچہ ایسا ہونے کا امکان نہیں لیکن انصاف کی خاطر یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے داماد کی بیوی اس سے کم تعلیم یافتہ ہو اس لیے اگر اوشا فیل ہو گئی اور تم پاس ہو گئے تو بھی میں یہ رشتہ رد کر دوں گا۔ البتہ اگر تم دونوں ہی فیل ہو گئے تو بات دوسری ہے۔ لیکن خیر اوشا تو ہمیشہ فرسٹ ڈویژن پاس ہوتی رہی ہے تم اپنی خیر مناؤ۔"

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے شرما جی نے کہا۔ اس کے بعد میں نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن بخشی جی نے یہ کہہ کر مجھے اپنے کمرے سے نکال دیا کہ نہ آج سے تم اوشا سے ملنا اور نہ امتحان کے نتیجے سے قبل میرے پاس آنا ورنہ نہ صرف اس رشتے کو ختم سمجھنا بلکہ اسپتال میں اپنے لیے جگہ بھی مخصوص کرا لینا۔ اب بتاؤ اس نیم پاگل انسان سے میں اور کیا کہتا! چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آیا جہاں اوشا نہ صرف میرا انتظار کر رہی تھی بلکہ یہ ساری گفتگو انتہائی کرب اور بے چینی سے سن رہی تھی اور ہم لوگ ایک دوسرے سے آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں تمناؤں کی ایک دنیا لیے لیکن زبان سے ایک لفظ کہے بغیر جدا ہو گئے! اور غالباً ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے! اب بتاؤ میں کیا کروں؟ کورس کی ان نامعقول اور ناپسندیدہ کتابوں سے مغز پچی نہ کروں تو کیا دریا میں پھاند کر اپنی جان دے دوں؟"

میں شرما جی کی یہ داستانِ محبت سن کر دنگ رہ گیا اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ چھوڑیے اس اوشا کی بچی کو۔ اس سال فیل ہو گئے تو کیا ہوا؟ پار سال دوسری لڑکیاں ہم جماعت ہو جائیں گی ان میں سے کوئی اوشا سے بھی اچھی ڈھونڈ لیجیے گا! اور پھر محض ایک لڑکی کی خاطر کورس کی کڑوی اور کسیلی کتابیں چاٹ کر منہ بدمزہ کرنے سے کیا فائدہ! اتنے دنوں جیسے زندگی کی جادواں، پیہم دواں، ہر دم جواں رکھا ہے ویسے ہی اب بھی رکھیے ع "آخری وقت میں کیا خاص مسلماں ہوں گے" وغیرہ وغیرہ لیکن شرما جی پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ "ہائے اوشا" اور "وائے اوشا" ہی کرتے رہے۔

اس کے بعد ان کو دائرہ انسانیت میں لانے کے لیے میں نے برادرانہ اور افلاطونی محبت اور خفیہ شادی وغیرہ کے امکانات ذہن نشین کرانا چاہے لیکن شرما جی نے

مجھے بری طرح جھڑک دیا " میں کسی عورت کو حاصل کرنے کے لیے شرافت سے گرا ہوا کوئی طریقۂ کار اختیار کرنا بلکہ سوچنا ہی ننگ انسانیت سمجھتا ہوں! شرافت کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عورت سے صرف شادی کرنے کے لیے عشق کیا جائے اور باقاعدہ عشق کا امتحان پاس کرکے اسے اپنے بچوں کی ماں بنایا جائے۔"

مجبوراً میں نے شرما جی کو ان کی کتابوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ دو چار روز میں ان کا یہ بخار اتر جائے گا۔ لیکن وہ پڑھنے میں ڈوبے تو ایسا ڈوبے کہ پھر ابھرنے کا نام ہی نہ لیا۔ پڑھائی کی خاطر انھوں نے ہوسٹل چھوڑ کر ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا جو ہر وقت اندر سے مقفّل رہتا تاکہ ان کے یار دوست آکر مخل نہ ہو سکیں انھوں نے اپنے بڑے بڑے بالوں کے بجائے سر گھٹا ڈالا اور اپنی خوبصورت کھوپڑی چھپانے کے لیے کالج جاتے وقت وہ ایک چھوٹی سی گاندھی کیپ بھی لگانے لگے۔ کالج کے پروفیسروں اور طالب علموں میں شرما جی کی اس نئی اور انتہائی غیر متوقع کروٹ سے حیرت واستعجاب کا ایک تہلکہ مچ گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر شرما جی بے چارے پڑھائی کے اس بے ساختہ میعادی بخار میں کیسے مبتلا ہو گئے کوئی کہتا پڑھ نہیں رہے ہیں بلکہ اپنی سوانح عمری قلمبند کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا کہ وہ دروازے بند کرکے جعلی نوٹ چھاپنے کی مشق کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا کوئی عورت بھگا لائے ہیں۔ اسی لیے وہ پردہ داری ہے۔ البتہ جب اوشا بخشی کے سامنے شرما جی کی پڑھائی کا چرچا ہوتا یا کالج میں وہ شرما جی کو دیکھ پاتی تو اس کے چہرے پر سرخیاں پھیلنے لگتیں۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیاں اور بھی گہری ہو جاتیں۔ اس کے منہ سے باہر نکلے ہوئے دونوں دانت بڑی دل آویزی سے چمک اٹھتے اور وفورِ محبت سے اس کا انگ انگ ایک پرکیف انگڑائی لیتا ہوا دکھائی دینے لگتا۔

بالآخر وہ تاریخی رات بھی آگئی کہ جس کی صبح کو امتحان شروع ہونے والا تھا۔ میں شرما جی کا حال چال دیکھنے ان کے گھر پر پہنچا تو خلافِ معمول دروازے کھلے ہوئے تھے میں اندر پہنچا تو دیکھا کہ شرما جی اپنا اسباب باندھے بڑی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ خداوندا یہ کیا نیا شگوفہ کھلا!

" کیا ارادے ہیں بچا؟ "

" میں گھر واپس جا رہا ہوں ابھی نو بجے کی گاڑی سے۔ نوکر تانگہ لینے گیا ہے۔"

" اور امتحان؟ "

" میرے لیے امتحان ختم ہو چکا۔"

" کیا مطلب؟ "

" چار مہینے پڑھتے پڑھتے دن رات ایک کر دیے لیکن ہنوز روز اوّل ہے ۔ جو کتاب پڑھتا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نئی دریافت کی ہوئی دنیا کا جغرافیہ پڑھ رہا ہوں، جانتا ہوں کہ میرا ڈبّا گول ہے لہذا امتحان میں بیٹھنے سے فائدہ ؟ میں ہوں اپنی شکست کی آواز"۔
شرما نے بڑی مایوسی سے کہا۔
" میں بھی امتحان میں نہیں بیٹھ رہا ہوں" میں نے منہ بسور کر کہا۔ مجھے دفعتاً ایک لاجواب ترکیب سوجھ گئی تھی۔
" تم کیوں نہیں بیٹھ رہے ہو؟" شرما جی نے چچا بن کر تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔
" والد صاحب نے فرمایا تھا کہ مجھے اس سال فرسٹ ڈویژن لانا چاہیے ورنہ امتحان میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ اس سال میری تیاری فرسٹ ڈویژن والی نہیں ہے لہذا میں امتحان میں نہیں بیٹھ رہا ہوں"۔" ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس، ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارمان ہوں گے" شرما جی نے اپنے بستر بند کے کسے ہوئے تسموں کو اور زیادہ کستے ہوئے کہا۔
اتنے میں ملازم تانگہ لے کر آگیا اور اس کے اور تانگے والے کے ہاتھوں شرما جی کا اسباب اٹھ اٹھ کر تانگے پر جانے لگا۔ شرما جی میری جانب الوداعی بغل گیری کے لیے بڑھے تو میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا،" چچا میں نے زندگی بھر آپ کی نصیحتیں اور ہدایتیں مانی ہیں حتیٰ کے دو دفعہ کالج سے نکالے جانے تک کی نوبت آگئی تھی لیکن میں نے آپ کے احکام سے منہ نہیں موڑا۔ اب ایک میری درخواست ہے یعنی آپ کے اکلوتے حقیقی بھتیجے کی ضد بلکہ بالک ہٹ ہے اسے منظور کر لیجیے"۔
" کہو! کہو۔ میں نے نوکر سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ کورس کی ساری نئی کتابیں جو میں نے خریدی ہیں وہ کل تمھارے کمرے میں ڈال آئے!"
" چچا کورس کی کتابیں گئیں چولھے بھاڑ میں! میں دوسری بات کہہ رہا ہوں! میں امتحان یقیناً پاس کر سکتا ہوں لیکن فرسٹ ڈویژن میں نہیں۔ میرا سال تو بے کار جا ہی رہا ہے۔ میرے اور آپ کے مضامین ایک ہی ہیں۔ ایسا کیوں نہ کیجیے کہ میں آپ کے نام سے کاپیاں لکھوں اور آپ میرے نام سے۔ آپ پاس ہو جائیے گا اور مجھے فیل ہو جانے کا غم نہ ہوگا"۔
شرما جی کے چہرے پر تفکّر کی گہری لکیریں نمودار ہوئیں۔ پھر ایک دم بشاشت چھا گئی۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ مایوسی میں تحلیل ہونے لگی!" تم میرے لیے یہ قربانی کر رہے ہو! میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است۔

میں نے بات کاٹ کر کہا "میں کوئی قربانی نہیں کر رہا ہوں۔ آپ بے جا تکلف کر کے نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اوشا جی کی زندگی بھی خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

اوشا کا نام سنتے ہی شرما جی پگھل گئے اور مجھ سے بے اختیار لپٹ کر انھوں نے میری تجویز منظور کر لی۔ تانگے پر سے اسباب واپس منگا لیا گیا۔ میری تجویز کے سارے نشیب و فراز اچھی طرح سے غور کرنے کے بعد اور "اوشا زندہ باد" کے نعروں کے ساتھ شرما جی اپنا بستر کھول کر سونے کے لیے لیٹ گئے اور میں ہاسٹل واپس چلا گیا۔

امتحان آیا اور چلا گیا اور ہم لوگوں کی سازش کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ میں نے شرما جی کی، شرما جی نے میری کاپیاں لکھیں۔

نتیجہ نکلنے کے دن قریب آئے تو مجھے تار دے کر شرما جی نے اپنے گھر بلا لیا۔ نتیجہ نکلا تو اخبار دیکھتے ہی مجھے چکر آ گیا اور اخبار میرے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا میں سکنڈ ڈویژن میں پاس تھا اور شرما جی فیل تھے! شرما جی نے اخبار اٹھا کر دیکھا تو خوشی کی بے اختیارانہ چیخ کے ساتھ پہلے ہوا میں اچھلے اور پھر رقص کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔ "بھتیجے تو نے میری عزت رکھ لی! تو نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ تا زندگی نہیں بھول سکتا!" میں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ فرط مسرت سے ان کے آنسو نکل رہے تھے۔ بڑی دقت سے گلو گیر آواز میں بولے "دیکھو اوشا بھی فیل ہے! اگر میں پاس ہو جاتا تو میری اوشا ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھوں سے نکل جاتی!"

بعد میں شرما جی کی بہت سی الٹی سیدھی باتوں کے درمیان پتا یہ چلا کہ پنڈت نردوش نرائن کے حکم کے بموجب شرما جی اوشا سے ملے تو نہیں لیکن بخشی جی کے کتے کے ذریعے سے وہ آپس میں خط و کتابت کرتے رہے تھے۔ شرما جی نے ہاسٹل چھوڑ کر بخشی جی کے گھر کے قریب اسی مصلحت سے مکان لیا تھا کہ وہاں وہ کتے کو کھانے کی چیزوں کی رشوت دے کر لے آیا کرتے اور بالآخر وہ خود آنے لگا تھا۔ اوشا نے اس کی گردن میں ایک ایسا پٹا سی کر باندھ دیا تھا کہ اس کے اندر ایک جیب بھی تھی جس میں کوئی خط بآسانی رکھا جا سکتا۔ امتحان کے قریب جب شرما جی اپنی کامیابی سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے اوشا کو مطلع کر دیا تھا کہ ان کا جہاز ڈوب رہا ہے۔ اوشا کو میری اور شرما جی کی سازش کا علم نہ ہونے پایا تھا لہذا اس غریب نے بھی ان کے جہاز کو ڈوبتا سمجھ کر خود اپنی کشتی ڈبو دی تھی! اس کو کہتے ہیں سچی محبت!

"بخشی جی کا کتا سگِ لیلیٰ کی نسل سے معلوم ہوتا ہے" شرما جی نے جھوم کر فرمایا۔

" سچ پوچھیے تو جو ڈگری مجھے ملنے والی ہے اس کا مستحق وہی بے زبان گتا ہے "
میں نے عرض کیا۔
نتیجہ نکلنے کے پورے پندرہ دن بعد ادشا بخشی ادشا شرما ہوگئیں مجھے اپنی ناگہانی کامیابی سے کچھ ایسی شرم آئی کہ میں نے مضامین بدل کر شرما جی اور ادشا جی کے ساتھ پھر بی۔ اے میں داخلہ لے لیا اور اس سال ادشا فرسٹ ڈویژن، میں سکنڈ ڈویژن اور شرما جی تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہو گئے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

# مرزا نخچیر

مرزا بڑی بدحواسی سے گھر میں گھسے تو کواڑوں کو اس زور و شور سے بند کیا کہ صرف ان کی چولیں کیا مکان کی بنیادیں بھی ہل گئیں کنڈی بند کر کے اندر پہنچے تو ترکاری کے جھولے کو تخت پر پھکا اور شیروانی اتارنے سے زیادہ نوچ کر الگنی کی طرف ایسی تاک کر پھینکی کہ وہ الگنی کو پھاند کر گھڑونچی سے جا لپٹی۔ اس کے بعد اظہارِ وحشت کے لیے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنی ٹوپی اتار کر بیوی کے پاندان پر دے ماری اور اپنی داڑھی کھجلاتے ہوئے صحنچی میں ٹہلنے لگے۔

اس ساری کارروائی کا خاموش تماشائی صرف گھر کا کتا شیرا تھا جو پلنگ کے نیچے اطمینان سے لیٹا ہوا ایک آنکھ بند کیے اور ایک کھولے، مرزا کی حرکات کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مرزا کی نظریں اس پر پڑیں تو انھیں اس کے اس طرح دیکھنے میں ایک کھلا ہوا انداز تمسخر نظر آیا۔ وہ جلبلا کر اس کی طرف بڑھے اور اس کے قریب پہنچ کر "چل بے یہاں سے ناشدنی!" کہا، تو وہ بڑی شانِ استغنا سے مٹکتا دم ہلاتا، باورچی خانے کی طرف چل پڑا۔ مرزا کو اس کی یہ ادا پھوٹی آنکھ نہ بھائی بلکہ اس خیال سے دل پر چوٹ سی لگی کہ دیکھو یہ ٹکے کا جانور بھی مجھے مسخرا سمجھ کر منہ چڑاتا ہے۔ انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ شیرا دُم نہیں ہلا رہا ہے بلکہ دراصل اپنی دم سے انھیں ٹھینگا دکھلا رہا ہے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پیر کا جوتا اتار کر اس سے زیادہ اس کی دم کو تاک کر مارا۔ جوتا کئی سو میل کی رفتار سے پرواز کرتا ہوا کتے کی دم سے کئی گز فاصلے پر پانی سے بھرے ہوئے تسلے میں غڑاپ سے جا ڈوبا اور اس آواز سے اوپر چھتری پر بیٹھے ہوئے کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑ پڑے۔

ایک جوتے کی مفارقت نے مرزا کو دوسرا جوتا بھی اتار کر پلنگ پر بیٹھ جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ اب انھوں نے ہانک لگائی۔ "ارے کہاں ہو جمّن کی ماں؟" جواب نہیں ملا تو پھر چیخے۔ "سانپ سونگھ گیا ہے سب کو اس گھر میں!" اور پھر مقابلتاً کچھ دھیمے

لہجے میں بڑبڑائے "کیا سب اللہ کے پیارے ہو گئے اس قبرستان میں ؟"

"کیوں کیا ہوا؟ آج ترکاری لینے گئے تو بس بازار ہی کے ہو گئے۔ لڑکے باسی دال کھا کر اسکول سدھارے ہیں۔ آپ کو کیا؟"

"لڑکے اسکول سدھارے ہیں اور میں جیل خانے سدھار رہا ہوں۔ اب تو بر آئی آپ کی منہ مانگی مراد؟"

"کیا ہذیان بک رہے ہیں آپ؟ جیل جانے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے"

آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم بغیر دل گردے کے زندہ ہیں اب تک! چہ خوش!! ذرا ابھی جو تھانے کے سپاہی آئیں گے ہم کو پکڑنے تو بس آپ کی اس صفائی پر کہ ہمارے دل گردہ نہیں ہے، وہ ہمیں چھوڑ کر منہ پیٹتے واپس چلے جائیں گے۔"

"کیسا تھانہ اور کیسے سپاہی؟ کیا اس موئے بانگڑ و داس کے یہاں شطرنج کھیلتے ہوئے دھر لیے گئے؟ یہی کہتی تھی ..."

"بس بس خدا کے غضب سے ڈریے۔ میرا ہر دوست آپ کو لچا اور شہدا ہی نظر آتا ہے۔ خبردار جو ہم نے کسی کی شان میں کوئی ناشایستہ الفاظ سنے۔"

"خود ہی پولیس اور تھانے کا قصہ لے بیٹھے ہیں آپ؟ پولیس لچوں اور شہدوں کے پیچھے نہیں گھومتی ہے تو اور کس کے؟"

"اب یہاں آکر پوری بات سنیے گا یا وہیں سے حلق میں لاؤڈ اسپیکر لگائے سارے محلے میں میری بداعمالیاں اور بدقماشیاں نشر کرتی رہیے گا۔"

"اور ہانڈی کو چولھے پر جلنے کے لیے چھوڑ دوں؟"

"چولھے میں گئی ہانڈی، ہمیں نہ ہوں گے تو ہانڈی کیا آپ کا سگا شیرا کھائے گا؟"

"اے نوج! شیرا میرا سگا کیوں ہونے لگا، سگا ہو گا تمھارا جو ایسے خبیث کتے پر جان چھڑکتے ہو۔"

"ہم جان چھڑکتے ہیں شیرا پر؟ اجی حد کر دی جھوٹ کی تم نے بھی۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ کتنا مبارک دن ہو گا وہ جب اس نجاست کی پوٹ سے ہمارا گھر پاک ہو جائے گا۔ ہم تو دعا مانگتے ہیں کہ وہ کم بخت کل کو مرتا ہو تو آج ہی مر جائے۔"

"کیوں کسی بے زبان کا صبر سمیٹتے ہیں آپ؟"

"اجی وہ بے زبان ہے اور ہم زبان دراز! ڈیڑھ ہاتھ کی تو دُم ہے اس سالے کی۔"

"ہزار بار منع کر دیا کہ اس قسم کے واہی تباہی رشتے مت جوڑا کیجیے!"

"تو کٹوا کیوں نہیں دیتیں دُم اس کی؟"

"اس کی دُم آپ کو کیا کھلتی ہے؟"

"یہ بھی ایک ہی رہی گویا کہ ہمیں اس کی دُم سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ ہم اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی بھٹیار خانے میں رہتے ہیں!"

"توبہ توبہ! ناک میں دم کر دیتے ہیں آپ! اپنی اوٹ پٹانگ بکو اس سے!"

"سرکاری سپاہی ہمارا وارنٹ گرفتاری لیے محلّے میں گھوم رہے ہیں، اور یہ عورت کُتّے کی دُم کا قصّہ لیے ہماری جان کو رو رہی ہے۔"

"دُم کا قصہ میں نے شروع کیا تھا؟"

"اور کیا ہم نے جس کا ایک پیر حوالات کے اندر ہے؟"

بیگم باورچی خانے سے باہر نکل آتی ہیں۔ "دشمنوں کے کان بہرے یہ حوالات کون جا رہا ہے اور کیوں؟"

"دشمنوں کے کان بہرے بھی ہوں گے تو بھی آپ کی چیخ پکار سے سن لیں گے کہ یہ ناچیز فدوی، حقیر، دگیر، المتخلص بہ بخچیر جیل جارہا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟ جیل میں بھی کوئی مشاعرہ ہو رہا ہے؟"

"جیل میں مشاعرے کی بھی ایک ہی رہی۔ اجی بیگم صاحبہ جیل میں غزلیں نہیں پڑھی جاتیں بلکہ چکّیاں پیسی جاتی ہیں۔ آپ نے مولانا حسرت موہانی کا وہ مشہور شعر نہیں سُنا، مشق سخن اور چکّی کی مشقت والا۔"

بیگم مرزا کے پاس ہی پلنگ پر آکر بیٹھ جاتی ہیں اور پان دان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں۔ "اب خدا کے لیے بتا بھی چکیے کہ کیا بات ہے۔ جب بھی گھر میں قدم رکھتے ہیں آپ مجھے دہلانے کے لیے کوئی نیا شگوفہ چھوڑ دیتے ہیں۔"

"گویا کہ ہم اپنی خوشی سے تفریحاً محض تبدیلِ آب و ہوا کے لیے جیل جارہے ہیں، اور وہاں کسی مشاعرے میں غزل پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"للّٰہ اب رحم کیجیے اور بتا بھی دیجیے کہ خدانخواستہ جیل جانے کی کیا بات ہے۔"

"جان بوجھ کر انجان بنتی ہیں آپ! اجی وہی افیم کا معاملہ پھر میرے کسی دشمن نے کھڑا کر دیا ہے!"

"بیس سال تو ہو چکے ہیں اس موئے معاملے کو اور ابھی تک وہ کسی بھوت کی طرح آپ کے سر پر سوار ہے۔"

"اجی میں نے بھی تو وہ تھپڑ دیا تھا اس افیمچی کے منہ پر کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا اس کے باپ کو۔"

"لیکن گھر آکر جلدی اور تیوانا تو آپ ہی کے منہ پڑ گیا تھا۔"

"اجی وہ تو میں تھپڑ مارنے کی جھونک میں خود گر گیا تھا نالی میں۔"

"اچھا تو یوں ہی سہی کہ آپ نے کسی افیچی کے تھپّڑ مار دیا تھا تو اب بیس سال کے بعد وہ معاملہ پھر کیسے کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"تھپّڑ مارتے وقت میں نے اسے اپنا نام اور پتا کب بتا دیا تھا۔ وہ کم بخت افیچی اتنا زبردست تھپّڑ کھانے کے بعد نچلا کب بیٹھا ہو گا۔ میرا نام اور پتا دریافت کرتا پھرا ہو گا، اور اب جب میرے کسی دشمن نے اسے بتا دیا ہو گا تو اس نے میرے نام کا وارنٹ کٹا دیا ہے۔"

"لیکن یہ واقعہ تو مراد آباد کا تھا اور اب آپ بیس سال سے لکھنؤ میں ہیں اور آپ نے اپنا تخلّص بھی دلگیر بدل کر نخچیر رکھ لیا ہے۔"

"اجی ایک ہی مملکت کا معاملہ ہے اور پھر تین گھنٹوں میں مراد آباد سے لکھنؤ میل گاڑی آتی ہے۔"

"ہر دوسرے تیسرے مہینے جب کسی کانسٹبل کو دیکھ لیتے ہیں آپ فوراً اس جھاڑو پھرے افیچی کا قصّہ یاد کر کے ہولنے لگتے ہیں۔"

"قسم ہے آپ کے سر کی ابھی جب میں بازار سے واپس آ رہا تھا تو بانگرو داس کے چبوترے پر خفیہ پولیس کے کچھ لوگ میرا اور میرے والد بزرگوار مرحوم کا نام لے کر بلکہ ایک سرکاری کاغذ سے پڑھ پڑھ کر میرے گھر کا پتا پوچھ رہے تھے۔"

کوئی باہر دروازے کی کنڈی کھڑکھڑاتا ہے۔ بیگم دروازے کے پاس چلی جاتی ہیں اور مرزا ہڑبڑا کر پلنگ کے نیچے گھس جاتے ہیں۔

"کیا مرزا نخچیر ولد مرزا دلاور جنگ تشریف رکھتے ہیں؟

بیگم "کون صاحب ہیں؟"

"کیا مرزا صاحب باہر تشریف لا سکتے ہیں؟"

"کیا کام ہے؟"

بانگرو داس "بھابی تسلیم! میں ہوں بانگرو داس! میرے ساتھ پھکڑی مل، نبّن خاں اور کچھ اور لوگ گھامڑ پرشاد کے لیے بھائی صاحب اور آپ کا ووٹ مانگنے آئے ہیں۔"

"تو اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ جدھر آپ اُدھر ہم۔"

(کئی آوازیں) شکریہ! بہت بہت شکریہ! بھولیے گا نہیں گھامڑ پرشاد کا انتخابی نشان گدھا ہے۔"

بیگم مسکراتی ہوئی صحنچی میں واپس چلی آتی ہیں۔ مرزا صاحب کپڑے جھاڑتے ہوئے پلنگ کے نیچے سے برآمد ہوتے ہیں۔

"بیگم نے مسکرا کر پوچھا
"یہ کیا؟ یا وحشت!"
مرزا نے غصے کا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔
"اجی وہ شیرا کا بچہ میرا ایک جوتا کہیں اٹھائے گیا ہے اسی کو پلنگ کے نیچے ڈھونڈ رہا تھا۔"

# پولیس رپورٹ

(تھانہ کی عمارت میں داخل ہو کر ہیڈ محرر کے دفتر کی چق کے سامنے جس کے پیچھے کچھ کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں مرزا بودم بیگ ہانک لگاتے ہیں)

مرزا: کوئی صاحب ہیں؟

(کوئی جواب نہیں ملتا لیکن اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں بدستور آتی رہتی ہیں)

مرزا: (زیادہ زور سے) کوئی صاحب ہیں؟ مجھے ایک رپورٹ لکھوانی ہے۔

(کمرے کی آوازوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ باتیں کرنے والوں میں کوئی شخص ہنسنے لگتا ہے)

مرزا: (چیخ کر) مجھے ایک رپورٹ لکھوانی ہے۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

ایک آواز: یہ کون بھونک رہا ہے؟

دوسری آواز: ذرا دیکھو تو یہ کس کی حلق میں خارش ہو گئی ہے؟

(چق کی آڑ سے کوئی مرزا کو دیکھتا ہے)

ایک آواز: اسامی تو کوئی موٹی نظر آتی ہے!

مرزا: (غصہ سے بھونکنے کے انداز میں) کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

دوسری آواز: پرسوں جب سے وہ مفتی رپورٹ لکھی ہے کچھ ایسی نسیٹھ ہو گئی ہے کہ پھر سالا کوئی قاعدے کا شکار ہی نہیں پھنسا۔

ایک آواز: بلا بھی لے سالے کو! کچھ دے ہی جائے گا، اپنا کیا لے جائے گا؟

مرزا: (انتہائی غیظ و غضب سے) میری اور آپ کی کسی قسم کی رشتہ داری نہیں ہے۔ تھانے کا یہ احاطہ غالباً احاطۂ تہذیب سے باہر ہے، میں کچھ دینے نہیں آیا، ایک رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

ایک آواز: آدمی کچھ ٹیڑھا نظر آتا ہے۔ کہیں کسی نیتا کا بھتیجا یا داماد نہ نکل آئے؟

دوسری آواز: سانپ کے بل میں سانپ کو سیدھا ہی جانا پڑتا ہے۔ یہاں جو آئے گا۔ سیدھا ہی آئے گا۔ نہیں تو سیدھا کرکے بھیجا جائے گا۔

مرزا: (بیر پٹختے اور ٹوپی اتارکر بال کھسوٹتے ہوئے) کیا میں اندر آسکتا ہوں؟

ایک آواز: اجی آپ کو اندر آنے سے کس نے روکا ہے؟ آپ خود ہی تو چیخ چیخ کر اپنے آپ کو ہلکان کررہے ہیں۔

(مرزا بڑی تیزی سے چق اٹھاکر دفتر میں داخل ہونا چاہتے ہیں لیکن چق سے الجھ جاتے ہیں۔ وہ گرجاتی ہے اور مرزا خود بھی گرہی رہے تھے کہ دفتر کی ایک کرسی کا سہارا پاکر سنبھل جاتے ہیں۔ البتہ ان کا ہاتھ لگ جانے سے اس پر بیٹھے ہوئے ایک کانسٹبل کی پگڑی اچھل جاتی ہے۔ ہیڈ محرر جو سامنے تخت پر ایک ڈیسک کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ اس گھبراہٹ سے اٹھ بیٹھتا ہے۔ کانسٹبل مرزا کو بڑی خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی اچھلتی ہوئی پگڑی کو اپنے ہاتھوں سے روک کر اپنے سر پر دوبارہ رکھ لیتا ہے۔ مرزا اسی کے پاس ایک خالی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

ہیڈ محرر: (چشمہ لگاتے ہوئے) کیا ارادے ہیں آپ کے؟

مرزا: مجھے ایک اطلاعی رپورٹ درج کرانی ہے۔

ہیڈ محرر: یہ تو ہم تین گھنٹوں سے سن رہے ہیں۔ لیکن کیا رپورٹ درج کرانے کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے آپ نے چیخ چیخ کر سارا تھانہ سر پر اٹھا لیا۔ پھر سرکاری سامان کا نقصان کیا۔ یعنی دروازے کی چق توڑ ڈالی اور پھر ستم بالائے ستم آپ نے ایک کار منصبی پر متعین کانسٹبل کی پگڑی اُچھال دی؟

مرزا: میں دفتر میں آنے کی اجازت طلب کررہا تھا اور آپ باوجود میری آواز سننے کے مجھے جواب نہیں دے رہے تھے، بلکہ میرے متعلق گستاخانہ کلمات بھی استعمال کررہے تھے لہٰذا میرا اپنی آواز بلند کردینا ایک اضطراری فعل تھا اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ چق کا توڑنا یا کسی کانسٹبل کی پگڑی اچھالنا میرا ارادی فعل نہیں محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔

ہیڈ محرر: یہ تھانہ ہے عدالت نہیں۔ یہاں مجرم کی نیت نہیں بلکہ صرف اس کی حرکت دیکھی جاتی ہے۔

مرزا: تو آپ کا خیال ہے کہ میں صرف تھانے کی چق توڑنے اور ایک کانسٹبل کی پگڑی اچھالنے اس لو اور دھوپ میں یہاں تھانے میں حاضر ہوا ہوں۔

ہیڈ محرر: میں بتا چکا ہوں کہ مجھے آپ کی نیت سے کوئی بحث نہیں، میرے سامنے تو صرف آپ کی حرکات ہیں اور ان کی روشنی میں تو آپ پر ہماری آسمانی کتاب تعزیرات ہند کی دفعات

۴۲۹، ۳۵۲ اور ۳۲۲ وغیرہ عائد ہو سکتی ہیں۔

مرزا: تو آپ کے تھانے میں آ کر میں کسی مجرم کے خلاف رپورٹ درج کرانے کے بجائے خود بھی مجرم ہو گیا! پگڑی کانسٹبل صاحب کے سر پر موجود ہے لیجیے میں چق ابھی درست کیے دیتا ہوں۔

(مرزا کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ جاتے ہیں اور گری ہوئی چق کو دوبارہ باندھ دیتے ہیں۔ ایک ڈوری کم پڑتی ہے تو اس کی بجائے اپنا رومال کام میں لے آتے ہیں)

مرزا: لیجیے، میری غلطی کی تلافی ہو چکی۔ اب براہ کرم میری رپورٹ درج کر لیجیے۔

ہیڈ محرر: آپ کے چیخنے چلانے سے درگزر کیا گیا۔ چق بھی آپ نے باندھ دی خیر۔ اس کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن آپ نے ایک کارِ منصبی پر متعین کانسٹبل کی پگڑی پر جو دست درازی کی ہے اس کے لیے کیا کیا جائے؟

مرزا: اس کے لیے میری یہ یقین دہانی کافی ہونی چاہیے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی اور اس کے لیے مجھے افسوس ہے اور زیادہ سے زیادہ کہیے تو میں خود اپنی ٹوپی بھی اچھال دوں۔

کانسٹبل: یہاں تھانے میں خالی افسوس سے کام نہیں چلتا۔ یہ تھانہ ہے قبرستان نہیں۔

ہیڈ محرر: اگر آپ کو اپنی حرکت پر واقعی افسوس ہے تو ہم لوگ بھی بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتے اور یوں بھی آپ ایک شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں لہذا آپ کانسٹبل صاحب کو پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر پیش کر دیجیے۔

مرزا: میں رشوت دینا جرم سمجھتا ہوں اور جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اس کے اوپر دیوار پر بھی ایک تختی لگی ہوئی ہے کہ رشوت لینا اور دینا پاپ ہے۔

ہیڈ محرر: رشوت دینا جرم ہے، پاپ ہے ایک اہم وقتی ضرورت۔ ان باتوں کے متعلق ہمیں کسی مزید معلومات کی ضرورت نہیں آپ سے کوئی رشوت نہیں مانگی جا رہی ہے بلکہ صرف آپ کے ایک جرم کی آپ سے تلافی کرائی جا رہی ہے۔

مرزا: مجھے اپنے جرم سے انکار ہے آپ میری رپورٹ لکھنی ہو تو لکھ لیجیے۔

ہیڈ محرر: میں آپ کی رپورٹ لکھنے سے پہلے آپ کے خلاف رپورٹ درج کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو اپنے جرم سے انکار ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہاں تھانے میں آ کر اپنی خوشی سے اپنے جرم کا اقبال کتنے آدمی کرتے ہیں؟ میں تو چاہتا تھا کہ یہ معاملہ دوستانہ طریقے پر طے ہو جائے لیکن اب آپ خود ہی پیچیدگیاں بڑھا رہے ہیں تو مجبوری ہے۔

مرزا: عجیب شکنجے میں پھانس رکھا ہے آپ نے؟ خیر اگر رشوت کا سوال نہیں ہے تو میں رفع حجت کے لیے ایک اٹھنی پیش کر سکتا ہوں،

کانسٹبل: (بگڑ کر) اٹھنی اور چونی چلتی ہے گھسیاری منڈی میں یہ سرکاری تھانہ ہے خالہ جی کا گھر نہیں۔ یہاں صرف سرکاری نوٹ چلتے ہیں۔

ہیڈ محرر: آپ اٹھنی کا ذکر کر کے ہم تھانے والوں کی عزت پر حملہ کر رہے ہیں۔ ہم کفن کھسوٹ نہیں۔ شریف آدمی ہیں۔ ہم نے سرکار کے ہاتھ اپنا ہاتھ بیچا ہے اپنی عزت نہیں بیچی۔

مرزا: یہ لیجیے ایک روپے کا نوٹ حاضر ہے اب بات ختم کیجیے اور میری رپورٹ درج کر لیجیے۔

ہیڈ محرر: دیکھیے آپ ہماری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہم کو مجبور کر رہے ہیں کہ ہم بھی اپنی شرافت کو خیر باد کہہ دیں۔ ہم نے ابھی تک آپ کی سفید پوشی کا خیال کر کے بڑے ضبط اور صبر کے ساتھ کام لیا ہے۔ یہاں مول تول نہیں ہوتا ہے بس آخری بات دو روپیا ہے اور اگر آپ یہ حقیر رقم بھی نہیں دینا چاہتے تو کوئی مضائقہ نہیں ہمیں ضابطے کی کارروائی کرتے کیا دیر لگتی ہے؟

مرزا: (دو روپے کا نوٹ پیش کرتے ہوئے) لیجیے براہ کرم میری رپورٹ درج کر لیجیے!

ہیڈ محرر: (نوٹ لے کر کانسٹبل کو دیتے ہوئے) لو تم جا کر چائے پیو۔ میرے لیے بھی کچھ لیتے آنا۔ (مرزا سے) ہاں بتائیے اب آپ کو کیا اور کس قسم کی رپورٹ درج کرانا ہے؟

مرزا: (ذرا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے) واقعہ یہ ہے کہ جس محلّے میں ہمارا گھر ہے وہاں چند غنڈے بھی آباد ہیں۔ جو شریف آدمیوں کی عزت کے درپے رہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہیڈ محرر: رپورٹ لکھوانے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے پہلے خود اپنا نام پتا اور نشان تو بتائیے۔

مرزا: (آہ سرد بھر کر) مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے۔ میرے دادا نواب ہمت النجش تھے اور میرے والد نواب طرّم خاں اور میرے نانا بخت بہادر۔ ۔ ۔

ہیڈ محرر: اجی حضرت! یہ آپ سے آپ کا سلسلۂ نسب کون پوچھ رہا ہے؟ آپ رپورٹ لکھوانے آئے ہیں یا اپنی شادی کا پیغام دینے؟

مرزا: میری رپورٹ کا تعلق میرے سلسلۂ نسب ہی سے ہے۔

ہیڈ محرر: رپورٹ کا تعلق سلسلۂ نسب سے ہونا میں نے آج ہی سنا خیر پہلے اپنا نام ولدیت پیشہ اور سکونت تو بتائیے۔

مرزا: آپ لکھنا شروع کیجیے تو میں بتاؤں۔

ہیڈ محرر: اجی رپورٹ لکھنے کا رجسٹر کیا یوں ہی خالی خولی بلا کچھ بھینٹ چڑھائے کھل جاتا ہے؟ ہنھ! سرکاری کاغذ کو ہنسی ٹھٹھا سمجھ لیا ہے آپ نے! پہلے میں زبانی تو سنوں کہ کیا رپورٹ ہے

اور کس طور سے درج ہونا چاہیے۔
مرزا : میرا نام ہے مرزا بودم بیگ، باپ کا نام طرّم خاں، پیشہ شاعری اور سکونت ہے محلہ نیلی چھتری اور مکان ہے گندے نالے پر شکلا بسکٹ فیکٹری سے متصل۔
ہیڈ محرر: مجرم کون لوگ ہیں ؟
مرزا : میں نے کسی کو خود جرم کرتے دیکھا تو نہیں البتہ میرا خیال ہے کہ جب سے پچھلے اتوار کو مشاعرے میں شیخ بقائی کی غزل میری غزل کے مقابلے میں پھسپھسا کر رہ گئی تھی وہ سخت رنجش مانتے ہیں بلکہ انھوں نے علی الاعلان مجھ کو کچھ ناگفتہ بہ دھمکیاں بھی دی ہیں۔
محرر : دیکھیے یہاں خیال سے کام نہیں چلتا۔ آپ کو مجرم کا نام بتانا پڑے گا۔ خیر وقتی طور پر شیخ بقائی کو ہی مجرم مان لیتا ہوں۔ ہاں تو واقعہ کیا ہے؟ آگے بڑھیے۔
مرزا : پرسوں رات کو کوئی ناشدنی میرے دروازے پر "گدھا" لکھ گیا۔ میں خاموش رہا۔ سمجھا کہ یہ بھی کسی فلم یا دوا کا اشتہار ہوگا لیکن کل رات کو کوئی ناہنجار میرے دروازے پر "الو کا پٹھا" لکھ گیا اور میں فوراً سمجھ گیا کہ اشارہ میری ہی طرف ہے اور اب لفظ "گدھا" کے معنی بھی مجھ پر آشکارا ہوگئے۔ بہرحال وہ میرا ذاتی معاملہ تھا لیکن اب جبکہ میرے سلسلۂ نسب پر یعنی میرے دادا مرحوم پر اس قسم کا ذلیل اور رکیک حملہ کیا گیا تو مجھے صبر کا یارا نہیں رہا اور میں رپورٹ لکھوانے آپ کے پاس آنے پر مجبور ہوگیا۔
ہیڈ محرر: (ہنستے ہوئے) مرزا صاحب۔ آپ بڑے سادہ لوح واقع ہوئے ہیں، بھلا اس قسم کی بچکانہ رپورٹیں تھانے میں لکھی جاتی ہیں ؟ ایسی رپورٹیں تو پرائمری اسکول کے بچے اپنے ماسٹر سے کیا کرتے ہیں۔
مرزا : (غصے میں) تو کیا واقعہ زیر بحث سے میری یا میرے والد کی بلکہ میرے دادا صاحب علیہ الرحمۃ کی توہین نہیں ہوئی ؟ کیا ازالۂ حیثیت عرفی کے متعلق آپ کی آسمانی کتاب میں کوئی دفعہ نہیں ہے ؟ کیا آپ نے ہر شہری کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جس دوسرے شہری کی چاہے عزت بلکہ سلسلۂ نسب بگاڑ دے ؟
ہیڈ محرر: آپ یہ لفاظی رہنے دیجیے۔ غالباً آپ سے بحث کرنا بیکار ہوگا۔ ازالۂ حیثیت عرفی کے متعلق میری آسمانی کتاب میں دفعہ ہے اور بڑی فوق البھڑک دفعہ ہے۔ لیکن میں دیکھوں تو اس کے استعمال کا آپ میں دم بھی ہے یا نہیں۔ مطلب یہ کہ اس کے لیے آپ کیا خرچ کر سکتے ہیں ؟
مرزا : خرچ کیا مطلب ؟ میں سمجھا نہیں! کیا یہاں رپورٹیں لکھائی نہیں خریدی جاتی ہیں !
ہیڈ محرر: اجی خرید و فروخت کہاں نہیں ہوتی۔ آپ تھانے آئے تھے تو کیا آنکھیں بند کر کے آئے تھے۔ راستے میں آپ کو کوئی دکان نہیں پڑی تھی ؟

مرزا : تو تھانہ بھی ایک دکان ہے جہاں رپورٹیں فروخت ہوتی ہیں؟ تو آپ لوگ تنخواہ کس بات کی پاتے ہیں؟

ہیڈ محرر: تنخواہ پاتے ہیں تھانے آباد رکھنے کی اور حکام کو سلام کرنے کی، باقی سب کام نقد اُجرت پر کیا جاتا ہے۔

مرزا : تو رپورٹ لکھنا آپ کے فرائضِ منصبی میں نہیں ہے؟

ہیڈ محرر: صرف قلم کاغذ پر گھسنا فرائضِ منصبی میں ضرور شامل ہے لیکن رپورٹ کی تصنیف اور تالیف کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔ رپورٹ لکھنے کے لیے کچھ طلب کرنا رشوت ہے، لیکن کسی رپورٹ کی طبع زاد تصنیف کے لیے معاوضہ مانگنا ہر مصنف کا پیدائشی حق ہے آپ خود شاعر ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ تصنیف اور تالیف کے متعلق یہ ابتدائی باتیں بھی نہیں جانتے۔

مرزا : (تعجب سے) میں کچھ نہیں سمجھا، مجھے تو آپ کی ہر بات سے اپنا قافیہ تنگ نظر آتا ہے۔

ہیڈ محرر: آپ کی عقل کا سارا دانہ اور گھاس تو، "گدھا" اور "الو کا پٹھا" چر گیا؟ اجی آپ ڈاکٹر کے یہاں جاتے ہیں اور اپنا مرض بیان کرتے ہیں تو پھر وہ نسخہ آپ کے مشورے سے لکھتا ہے یا اپنے دماغ سے؟

مرزا : اپنے دماغ سے بلکہ اپنے فاؤنٹن پن سے۔

ہیڈ محرر: بالکل اسی طرح جب کوئی رپورٹ درج کرانے والا آتا ہے تو وہ اپنی تکلیف بیان کر دیتا ہے۔ پھر رپورٹ ہم اپنے دماغ اور قلم سے لکھتے ہیں اور اسی کا ہم حق المحنت وصول کرتے ہیں اب جتنا معاوضہ دیا جاتا ہے رپورٹ لکھنے میں اتنی ہی حاضر دماغی سے کام لیا جاتا ہے۔ پرانی مثل ہے جتنا گڑ ڈالو گے، اتنا ہی میٹھا ہوگا۔

مرزا : مطلب یہ کہ رپورٹ آپ کی حاضر دماغی کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس حاضر دماغی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں اور ان کے لیے مقررہ نرخ سے معاوضے دینے پڑتے ہیں۔

ہیڈ محرر : جی ہاں! اب آپ واقعی سمجھداری کا ثبوت دے رہے ہیں اور ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ کے دروازے کے اندر ابجات کم سے کم کچھ مبالغہ آمیز ضرور ہیں۔

مرزا : اور آپ کی حاضر دماغی کے نرخ کیا ہیں؟

ہیڈ محرر: نرخ کیا ہیں یہی کہ چوری کی رپورٹ کے پانچ روپے۔ سرقہ بالجبر کے سات روپے معمولی مارپیٹ کے آٹھ روپے، اغوا کے دس روپے، ازالۂ حیثیت عرفی کے پندرہ روپے وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ کو پوری تعزیرات بند پڑھ کر کون سنائے؟ پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کس قسم کی رپورٹ درج کرانا چاہتے ہیں۔ ہر مقدمے کا بنیادی پتھر پولیس رپورٹ ہوا کرتی ہے۔ اس میں بخل سے کوئی اناڑی پن ہو گیا یا خامی

رہ گئی تو خود رپورٹ لکھوانے والے کا ڈبا گول ہو جاتا ہے۔

مرزا: میں تو اپنے واقعے کی صحیح رپورٹ درج کرانا چاہتا ہوں اور آپ کی تصنیف و تالیف کا زیر بار احسان ہونا نہیں چاہتا۔

ہیڈ محرر: تو آپ کے پاس نہ کوئی واقعہ ہے نہ ملزم کا نام دیتا۔ پھر آپ خود ہی فرما چکے کہ پہلے اندراج کو آپ اشتہار سمجھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرا اندراج بھی اشتہار ہی ہو۔ ایسی صورت میں آپ کی رپورٹ کیا اپنا سر لکھ لیا جائے؟ یہ تھانہ ہے کوئی مشاعرہ نہیں، جہاں بے سر وپا باتوں پر جھوٹی واہ وا کرکے شاعروں کا کا دماغ خراب کر دیا جاتا ہے۔

مرزا: آپ کو رپورٹ لکھنے سے انکار ہے تو نہ لکھیے مجھے داروغہ جی کے پاس بھیج دیجیے لیکن خبردار شاعروں کے متعلق منہ سے کوئی کلمۂ بد نہ نکالیے گا۔

ہیڈ محرر: بڑی خوشی سے۔ داروغہ صاحب اس طرف دکھن کے برآمدے میں لیٹے ہوئے تیل مالش کرا رہے ہیں البتہ اتنا سمجھ لیجیے کہ جو کام یہاں پانچ روپے میں ہو جائے گا وہاں وہ پندرہ روپوں میں بھی نہ ہو سکے گا۔

(مرزا بودم بیگ ہیڈ محرر کے پاس سے اٹھ کر داروغہ کے پاس پہنچتے ہیں۔ داروغہ تیل مالش کرانے کے ساتھ ساتھ ایک سیٹھ جی سے کچھ خفیہ باتیں کر رہا تھا۔ سیٹھ جی نے جیب سے ایک پوٹلی نکال کر میز کے نیچے سے داروغہ کے ہاتھ میں دے دی اور بڑی نیاز مندی سے سلام کرتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر چلے گئے۔ داروغہ نے بودم بیگ کی طرف نظر اٹھائی اور ان کے سفید کپڑوں کو دیکھ کر انھیں سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کا ہوائی اشارہ کیا۔

(بودم بیگ سلام کرکے بیٹھ جاتے ہیں)

مرزا: مجھے ایک رپورٹ لکھوانی ہے۔

داروغہ: غالباً جھوٹی رپورٹ لکھوانے کے نتائج سے آپ واقف ہی ہوں گے خیر بتلائیے کیا رپورٹ لکھوانی ہے آپ کو؟

مرزا: میں بالکل سچی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔ پرسوں رات میں میرے دروازے پر کوئی شخص "گدھا" لکھ گیا اور کل رات "الّو کا پٹھا" لکھ گیا۔

داروغہ: (قہقہہ لگاتے ہوئے) انتظار کیجیے کہ آج رات میں کیا لکھا جاتا ہے۔ کوئی آپ کا بے تکلف واقف کار ہوگا۔ ولی را ولی می شناسد!

مرزا: (بُرا مان کر) واقف کار نہیں کوئی ناہنجار، کندۂ ناتراش، بلکہ اپنے ماں باپ کی شامتِ اعمال ہوگا۔

داروغہ: اچھا یوں ہی سمجھ لیجیے! لیکن اس میں رپورٹ لکھانے کی کیا بات ہے؟ ہمارے سماج میں گدھا اور اُلّو کا پٹھا قسم کے الفاظ عموماً ڈلار میں بولے جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر سمجھدار ماں باپ اپنی اولاد کو خود کہا کرتے ہیں اور پھر آپ کو تو لکھنے والے کا نام بھی معلوم نہیں۔ نہ جرم نہ ملزم نہ گواہ۔ رپورٹ کیا خاک پتھر لکھی جائے اور محض تفریحاً رپورٹ لکھانا ہے تو ہیڈ محرر کے پاس جائیے اور اس کے مشورے سے کوئی رپورٹ لکھا دیجیے۔ میرا سر کیوں کھا رہے ہیں۔

مرزا: میں تفریحاً نہیں واقعتاً رپورٹ لکھانا چاہتا ہوں۔ گدھا اور اُلّو کا پٹھا قسم کے الفاظ سے نہ صرف میری بلکہ میرے والد بزرگوار اور دادا صاحب علیہ الرحمۃ کی سخت توہین ہوتی ہے اور اگر مجھے لکھنے والے کا نام نہیں معلوم ہے تو کیا ہوا۔ تفتیش کرنا پولیس کا کام ہے۔ میں مشتبہ لوگوں کے نام بتائے دیتا ہوں۔ آپ ان کے خط اور میرے دروازے پر لکھے ہوئے ناشایستہ الفاظ کے شانِ خط کا مقابلہ اور موازنہ بھی کر سکتے ہیں۔

داروغہ (ہنستے ہوئے) مجھے تعجب ہے کہ آپ کی ناسمجھی کی باتوں پر مجھے غصّے کے بجائے ہمدردی کیوں معلوم ہو رہی ہے۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں آپ کے بتائے ہوئے تمام لوگوں سے آپ کو گدھا اور اُلّو کا پٹھا لکھا کر آپ کے مکان کے دروازے کے پٹ کے ساتھ نتھی کر کے کسی ماہر خط کے پاس بھیج دوں۔ ہم پولیس والے آپ کے مشورے پر تفتیش کریں تو بس کر چکے نوکری! اجی ہمارا دائرۂ تفتیش ہمارے ڈنڈے کی پہنچ تک ہے۔ تفتیش جرم کریں ہمارے دشمن! ہم تو اپنے ڈنڈے کے اقبال سے اقبال جرم کراتے ہیں! لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ کے معاملے میں کہیں جرم بھی تو نظر آئے۔

مرزا: میری اور میرے والد کی توہین کو آپ کوئی جرم نہیں سمجھتے! اچھا یہی الفاظ اگر کوئی آپ کے اور آپ کے والد کے متعلق استعمال کرتا؟

داروغہ: تو میں رپورٹ لکھوانے تھانے کبھی نہیں جاتا بلکہ آپ دیکھتے کہ الفاظ استعمال کرنے والے ہی کو تھانے بلکہ اسپتال جانا پڑتا اور پھر دیکھیے محض دروازے پر کسی تحریر سے روئے سخن آپ کی جانب کیسے ہوگا؟ خود تھانے کی دیواروں پر عجیب عجیب عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ظالم لوشن۔ قوّت مردانگی کی شاندار گولیاں۔ کھانسی کو پھانسی وغیرہ وغیرہ لیکن اس سے میرا سلسلۂ نسب ہرگز خطرے میں نہیں پڑ جاتا۔ آپ اس قسم کی رپورٹ لکھانے پر اصرار کر کے ثابت کر رہے ہیں کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔ آخر اس رپورٹ کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

مرزا : ملزمان کو ان کے گذشتہ اعمال کی سزا اور آیندہ کے لیے تنبیہہ
داروغہ : تو پھر کوئی سمجھداری کی رپورٹ لکھائیے۔ مطلب تو ثواب سے ہے۔ رپورٹ سچ کے بل بوتے پر نہیں، جذبۂ انتقام کی شدت کی بنا پر لکھائی جاتی ہے۔ ملزمان نے آپ کے ساتھ کون سا شریفانہ برتاو کیا ہے جو آپ ان کے لیے راجہ ہریش چندر بنے جاتے ہیں ؟
مرزا : (زچ ہو کر) تو پھر آپ ہی کوئی مناسب رپورٹ لکھا دیجیے ! میرا دماغ تو تھانے حاضر ہونے کے بعد غیر حاضر ہو چکا ہے !
(داروغہ نے ہیڈ محرّر کو آواز دی۔ ہیڈ محرّر آگیا)
داروغہ : (ہیڈ محرّر سے) دیکھو آپ کی رپورٹ اس مضمون کی لکھ دو کہ کل شام کو جب آپ اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلے تو ملزمان ۔ ۔ ۔ ۔ (نام ان سے پوچھ کر لکھ دینا اور اس میں محلّے کے ایک آدھ پیشہ ور بلکہ پیدائشی بدمعاش کا نام ضرور آجانا چاہیے) پہلے سے گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو اور آپ کی بیوی کو دیکھ کر فوراً حملہ آور ہوئے بلکہ دست درازیاں شروع کردیں آپ نے اور آپ کی بیوی نے شور و غل کیا تو گواہان موقع پر آگئے اور ان کو دیکھ کر ملزمان گالیاں اور دھمکیاں دیتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ گواہوں کے نام ان سے پوچھ کر لکھ دینا البتہ اس میں فہرست دیکھ کر اپنے ایک آدھ مخصوص گواہ کا نام لکھنا نہ بھول جانا۔
(مرزا سے) جائیے آپ ان کے ساتھ چلے جائیے (مرزا ہیڈ محرّر کے ساتھ چلے جاتے ہیں)
داروغہ کی آواز سنائی دیتی ہے "اور ہاں ان سے رعایت کر کے صرف پندرہ روپے لے لینا !"
(ہیڈ محرّر مسکرا کر بودم بیگ کی طرف دیکھتا ہے اور وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے جیب سے پندرہ روپے نکال کر دیتے ہیں)

بودم بیگ رپورٹ لکھا کر تھانے سے باہر نکلے تو انھیں یاد آیا کہ کل چار بجے تو ان کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ بیوی شام کو چہل قدمی کے لیے کیسے جا سکتی تھیں اور بدھو گواہ تو دو برس سے جیل میں ہے اور جمعن گواہ چھ مہینے ہوئے اللہ کو پیارا ہو چکا۔ دفعتاً انھیں خیال آیا کہ شاید اُلّو کا پٹھا ان کے نوزائیدہ لڑکے کو لکھا گیا تھا۔ اور یہ ایک قسم کی مبارک باد تھی۔ وہ کھکھلا کر ہنس پڑے اور ان کے منہ سے یہ شعر بے ساختہ نکل گیا ؎

جو اُلّو کا پٹھا ہے اُلّو وہ خود بھی ہے
تو اُلّو کے پٹھے کا منشا غلط ہے

# ٹارزن

"وہ پھر موا آ پہنچا!" بیگم کا چلاّنا تھا کہ میں اخبار پڑھتے پڑھتے اُچھل پڑا اور میری نظر پہلے سامنے میز کی دراز پر پڑی جس میں ایسے ہی موقع کے لیے میں نے اپنا بھرا ہوا پستول رکھ چھوڑا تھا۔ بیگم ہکا بکا، آنکھیں پھاڑیں منہ کھولے، دوپٹے کو اپنی دُم بنائے کمرے کے سامنے باورچی خانے کو دیکھ رہی تھیں وہ غل مچانے ہی والی تھیں "غارت ہو خدائی پیٹا ۔۔۔" کہ میں نے لپک کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "بولو مت ورنہ بھاگ جائے گا۔" اور میز کی دراز سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا پستول نکالنے لگا۔

بات اصل یہ تھی کہ محلّے کے ایک آوارہ کُتّے نے ہم دونوں میاں بیوی کی جان عذاب کر رکھی تھی، کھانا تو خیر کھانے کی چیز تھی کھا لیتا۔ لیکن یہ کیا کہ پلیٹیں اور پتیلیاں منہ میں دبا کر بھاگ جاتا۔ خیر یہاں تک تو کتا پن کہا جا سکتا ہے مگر کم بخت کی کم ظرفی تو دیکھیے کہ کپڑے اٹھالے جاتا، پلنگ پر پیشاب کر دیتا، کبھو تروں کو ہشکا دیتا، مرغیوں کے پیچھے دوڑتا، کیاریوں کو روند ڈالتا اور رات کو عین ہمارے دروازے پر تمام محلّے کے کتّوں کو جمع کر کے مشاعرہ کرتا۔ بس کیا بتاؤں جان عاجز کر رکھی تھی اس موذی نے۔ کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا سب حرام تھا اس کی وجہ سے۔

ایک روز ہمارے ایک عزیز آئے اور اپنے دانتوں کی چاپ تخت پر نکال کر رکھ دی اور منہ دھونے لگے۔ وہ ناشدنی نہیں معلوم کہاں سے نمودار ہوا اور ان کی چاپ منہ میں رکھ دبا کر بھاگا۔ کیا عرض کروں کہ اس واقعے پر کیا خفّت اٹھانا پڑی مجھ کو؟ مجال کیا کہ یونی ورسٹی سے واپس آؤں اور بیگم کو آنسو پونچھتے ہوئے نہ پاؤں۔ "آج کتا گوشت اٹھا کر لے گیا"، "آج کتا دودھ پی گیا"، "آج کتا آپ کا ایک موزہ اٹھالے گیا"، "آج کتّے نے ایک مرغی کی ٹانگ پکڑ لی"۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس شکایتوں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جو کسی صورت ختم ہی ہونے کو نہ آتا۔

لاکھ جتن کیے کہ اس پاجی کتّے سے چھٹکارا مل جائے لیکن کوئی کارگر نہ ہوا۔ محلّے

میں اعلان کرایا کہ جو نیک بخت اس کم بخت کتّے کو پکڑ دے یا مار ڈالے اسے حسب حیثیت انعام دوں گا۔ گھر کا دروازہ بند کرایا، پھندے لگوائے۔ دہی میں زہر ہلاہل ملوایا لیکن ایک نہ چلی۔ یہ دروازہ بند ہوا تو وہ اس دروازے سے آگیا۔ کبھی ہمسایہ کی چھت سے پھاند پڑا، کبھی نالی سے گھس آیا۔ غرضیکہ کتا کیا تھا ایک بلائے بے درماں تھا۔ پھندوں کے وہ قریب نہ پھٹکتا، زہر کی اسے ایسی پہچان تھی کہ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو نہ ہوگی، ادھر سونگھا، ادھر اس کے قریب نہ گیا۔ اس کی چالاکی اور مکّاری دیکھ کر مولانا عبدالقدوس کے اس مقولے کی تائید ہو جاتی کہ ارواح خبیثہ کتّوں کا بھیس بھی اختیار کر لیتی ہیں اور خدا کے نیک بندوں کو پریشان کرتی رہتی ہیں۔

ایک روز اپنا پستول صاف کرتے ہوئے مجھے دفعتاً خیال آیا کہ کیوں نہ اس پستول سے اس موذی کتّے کو گولی ماردی جائے۔ پستول کا افتتاح بھی ہو جائے گا اور وہ شورہ پشت اپنے کیفر کردار کو بھی پہنچ جائے گا، ایک پنتھ دو کاج۔ چنانچہ میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ ایک روز سویرے سے پستول لے کر بیٹھا جائے اور باورچی خانہ بالکل خالی چھوڑ دیا جائے اور جوں ہی وہ منحوس جانور گھر میں داخل ہو اسے لقمۂ اجل بنا دیا جائے۔ میں نے ابھی تک یہ تجویز بیگم کو نہیں بتائی تھی اور ان کی لاعلمی میں پستول کو دراز میں رکھ چھوڑا تھا۔ بیگم پستول سے انتہائی خوف زدہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ پستول رکھنے والے شوہر اکثر خود اپنے آپ کو اس کا نشانہ بنا لیتے ہیں اور اپنی بیویوں کو بیوہ کرکے رونے کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر نہیں معلوم کس گدھے نے ان کو ذہن نشین کرادیا تھا کہ کبھی کبھی پستول الٹا بھی چل جاتا ہے، اور شکار کے بجائے خود شکاری چل بستا ہے اور بفرض محال اگر پستول قاعدے سے چل بھی جائے تو اس کی دہشتناک آواز سننے والے یقیناً بہرے ہو جاتے ہیں اور انھیں رعشے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

اس وقت میں نے جیسے ہی میز کی دراز سے پستول نکالا۔ بیگم چیخ مار کر میرے ہاتھ سے چمٹ گئیں اور ذرا نہ ہوتا تو پستول واقعی دغ ہی جاتا۔ ایسے نازک بلکہ نازک ترین موقع پر دفعتاً ہمارے ہم زلف صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ انھوں نے جو یہ منظر دیکھا کہ میرے ہاتھ میں پستول ہے اور بیگم اسے چھین رہی ہیں تو وہ یہ سمجھے کہ یا تو میرا ارادہ خودکشی کا ہے اور یا بیگم کے قتل کا اور اغلب یہ ہے کہ دونوں کا۔ لہٰذا وہ پستول کی نال کی سیدھ سے بچتے بچاتے باورچی خانے میں گھس گئے تاکہ اس سے ہو کر بغلی کمروں کو طے کرتے ہوئے میرے پیچھے پہنچ کر مجھ سے پستول چھین لیں لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ ادھر انھوں نے باورچی خانے میں قدم رکھا اور ادھر وہ پاجی کتا جو پہلے

سے وہاں موجود تھا جھپٹ کر ان کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل گیا، اور ہم زلف صاحب دھڑام سے چاروں خانے چت گر کر کھیت رہ گئے۔ اسی وقت میری اور بیگم کی کشمکش میں پستول بھی داغ پڑا۔

پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ساتھ ہی بیگم تیورا کر زمین پر گر پڑیں، میں یہ سمجھ کر کہ بیگم جاں بحق ہو گئیں نیچے جھکا اور بیگم یہ سمجھ کر کہ میں اللہ کا پیارا ہو گیا فوراً ہی اٹھ بیٹھیں۔ بہر کیف ہم دونوں ہی بخیریت تھے۔ لیکن ہم لوگوں نے سامنے جو باورچی خانے کی طرف دیکھا تو فضا میں دو بے اختیار چیخیں بلند ہو گئیں! ہمارے ہم زلف صاحب جن کی آمد کی ابھی تک ہم لوگوں کو خبر نہ تھی باورچی خانے کے دروازے میں آدھے اندر آدھے باہر اوندھے پڑے تھے اور پستول کی آواز سننے کے بعد باآواز بلند کلمۂ شہادت پڑھ رہے تھے۔ انھیں بڑی مشکل سے یقین آیا کہ گولی ان کے نہیں لگی ہے۔ بدقت تمام وہ اٹھے بلکہ اٹھائے گئے اور جھاڑ پونچھ کر دائرۂ انسانیت میں لائے گئے۔ اُن غریب کے ساتھ ستم بالائے ستم یہ ہوا تھا کہ دفعتاً زمین بوس ہو جانے میں نہیں معلوم کیسے توے کی بہت سی کالک ان کے چہرے تک پہنچ گئی تھی، خیر یہ بات ان کو بتانے والی تھی بھی نہیں کیونکہ یوں ہی ان کے غصے کا پارا ناقابل برداشت حد تک چڑھ چکا تھا۔ لہٰذا انھیں چہرہ پر سیاہ پالش کے ساتھ ہی گھر سے رُخصت کر دیا گیا۔

اس ناخوشگوار واقعہ کے بعد عرصہ تک ہم دونوں میاں بیوی ایک عجیب اداسی کے عالم میں رہے۔ کُتّے کی شرارتیں اور بے ہودگیاں ہم لوگوں کی زندگی کا معمول بن چکی تھیں۔ اور ہم لوگ قہرِ درویش بجانِ درویش کے مصداق انھیں برداشت کرتے اور ایک دوسرے کی دل آزاری کے خوف سے کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے بلکہ سچ پوچھیے تو ہم لوگوں نے کتّے کا ذکر ہی کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن جب بیگم کہتیں "آپ اپنا پستول مال خانے میں جمع کر دیجیے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے گھر میں اس کی موجودگی سے" یا میں کہتا "تلاش کر رہا ہوں، کوئی مکان مل جائے تو چھوڑ دوں اس منحوس محلے کو" تو کتّے کے نام کے اظہار کے بغیر ہم لوگوں کو اپنی گفتگو کے پسِ منظر میں وہی اپنا جان لیوا کتّا نظر آتا۔

اب کتّے صاحب کی جدّت طرازی ملاحظہ ہو کہ وہ ہماری پڑوسن صاحبہ کی ایک گم شدہ مرغی کے پر ہماری چھت پر ڈال گئے۔ پڑوسن صاحبہ نے یہ باقیات صالحات ملاحظہ کیے تو ان کے ہم لوگوں کے خلاف شبہات یقین میں تبدیل ہو گئے اور انھوں نے علی الاعلان اپنی مرغی چرانے اور اس کو نوش جان کر جانے کا سنگین الزام بیگم پر

لگا دیا۔ گھنٹوں مخالف چھتوں سے تو تو میں میں ہوتی رہی اور بالآخر محلّے بھر میں یہ عام شہرت ہوگئی کہ ہم سخت مرغی چور بلکہ مرغی خور قسم کے لوگ واقع ہوئے ہیں۔ اور اس بد نامی کے جواب میں ہم لوگ صرف اپنے دشمن جان کُتّے پر دانت پیستے رہ گئے۔ مرغی کے پروں کی چھت پر موجودگی کا ہمارے پاس جواب ہی کیا ہو سکتا۔

اس حادثہ کے بعد ہم لوگ ایک دفعہ پھر بڑے زوروں سے اس کُتّے کی جان لینے کے درپے ہوگئے، بیگم اس حد تک عاجز آچکی تھیں کہ ایک روز خود انھوں نے تحریک کی کہ وہ اپنی بہن کے یہاں چلی جائیں اور ان کی غیر موجودگی میں اپنے پستول سے، میں کسی پستول باز کو بلوا کر اس ناہنجار کُتّے کا ڈبّا گول کرادوں بڑے اہتمام سے خود میں نے اس پر نشانہ بازی کی بھی مشق کی لیکن کُتّا کچھ اس جیوٹ کا واقع ہوا تھا کہ بجلی اور چھلاوے کے بھی کان کاٹتا۔ کارتوس ختم ہوگئے اور کُتّا باقی رہا۔ چنانچہ شام کو جب بیگم اپنی بہن کے یہاں سے مسکراتی ہوئی آئیں اور آتے ہی پوچھا "کُتّا مَرا؟" تو قبل اس کے کہ میں کوئی معقول جواب سوچ بھی سکوں باورچی صاحب نے ایک تسلا اور دو تین رکابیاں اور پتیلیاں جن میں گولیوں سے سوراخ ہو گئے تھے سامنے لاکر رکھ دیں۔ "بی بی برتن نکال لیے تو کھانا چڑھاؤں، یہ تسلا تو بالکل چھلنی ہو گیا ہے۔ اور یہ پتیلی...." صرف اتنا کہہ سکا کہ نشانہ تو ٹھیک لگا تھا لیکن دم سے پھچھلتی ہوئی گولی نکل گئی۔"

ایک ہمارے بڑے تیس مار خاں قسم کے دوست تھے۔ ایک روز کُتّے کا اُن سے ذکر کیا تو خفا ہو کر بولے "یار آج تک تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا، چٹکیوں میں سر پھوڑ کر نہ رکھ دوں اس کُتّے کا تو یہ مونچھیں نہیں پتاور ہیں۔" اور بڑے جوش سے انھوں نے اپنی پتاور نما مونچھوں کو مروڑا۔ دوسرے روز رات کو آٹھ بجے یہ حضرت اپنے تین لٹھ باز ساتھیوں کے ساتھ میرے مکان پر تشریف لے آئے اور مختلف دروازوں پر مسلح ناکہ بندی کردی۔ بڑی اچھل پھاند، دھما چوکڑی اور لٹھ بازی رہی لیکن کتا تو ہاتھ آیا نہیں البتہ اس کے تعاقب میں میرے دوست جیسے ہی باورچی خانے سے نکلے ان کے ایک ساتھی نے ان کو کتا سمجھ کر ان کے سر پر ایک بھرپور لٹھ جڑ دیا۔ میں ان کے پیچھے تھا، وہ گرے تو میں بھی ان کے اوپر گرا اور چوکھٹ سے ٹکرا کر میرا سر بھی لہولہان ہو گیا۔ سویرے میری آنکھ کھلی تو میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور سامنے بیگم بیٹھی ہوئی دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ قریب پندرہ روز میں میری کھوپڑی

ٹھیک ہوئی۔

اور پھر ایک روز میں یونی ورسٹی سے لوٹا تو دیکھا کہ بیگم پریشانی سے صحن میں ٹہل رہی ہیں "یہ کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا، "دیکھو آکر" بیگم میرا ہاتھ پکڑے بغل کی تدواری میں لے گئیں۔ میں کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا؟ وہ ظالم وہ ناہنجار، وہ ناشدنی، وہ خونخوار اور وہ منحوس کتا ایک کونے میں کسی شیر خوار بچے کی طرح دبکا پڑا تھا اور ہانپتے ہوئے کراہ رہا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ بیگم اس کے پاس چلی گئیں اور اس کا سر اٹھا کر مجھ سے کہا۔ "آج بندر کے پیچھے چھت پھاندنے میں اس کے آگے کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔"

اس وقت مجھے اس غریب کتے پر بڑا ترس آیا اور یاد کرنے پر بھی اس کی کوئی شقاوت اور خباثت یاد نہیں آئی۔ میں نے فوراً وٹنری ڈاکٹر کو بلایا اور اس نے ہڈی جوڑ کر پلاسٹر چڑھا دیا۔ بیگم نے بوتل سے بچارے مجروح کتے کو دودھ پلایا اور اپنی نئی رضائی لا کر اس پر ڈال دی۔ ڈیڑھ مہینے تک بیگم بڑی شفقت مادرانہ سے اس کتے کی تیمارداری اور ناز برداری کرتی رہیں۔ اور یہ انھیں کی جاں فشانی کا نتیجہ تھا کہ وہ ٹھیک ہوگیا اور پھر چلنے پھرنے لگا۔ ورنہ نہیں معلوم اس بے چارے کی کیا درگت ہوتی۔

واضح رہے کہ اب وہ کتا محض کتا نہیں بلکہ اس کا نام "ٹارزن" ہے اور اس کے گلے میں بیگم کے ہاتھ کا سلا ہوا سرخ مخمل کا کامدار پٹا پڑا ہوا ہے۔ اب وہ نہ چور ہے نہ بد معاش، نہ اٹھائی گیر۔ بلکہ ایک انتہائی پُرامن شہری۔ مکان کا ایک انتہائی ذمےدار چوکیدار اور اپنے دوچاہنے والوں کا انتہائی فرمانبردار رفیق کار۔ اب وہ گھر میں کلیلیں لگاتا ہے تو خفا ہونے کے بجائے بیگم باغ باغ ہوجاتی ہیں اور وہ جہاں کہیں بھی ہو اور کچھ بھی کر رہا ہو اپنا نام لیے جانے پر فوراً حاضر ہو کر بڑی محبت سے پیروں پر لوٹنے لگتا ہے۔ البتہ نہیں معلوم کیا بات ہے کہ جب ہمارے ہم زلف صاحب اسے خونی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو وہ ان پر محض تکلفاً تھوڑا سا بھونک دیتا ہے اور وہ فوراً بدک کر اپنی اچھل کود سے سارے صحن کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔

گ اک چھیڑ ہے مراد اس سے امتحان نہیں

# پنڈت جی اور مونچھ

ہمارے دوست پنڈت کرپا شنکر اُنتیس سال سے مقامی اسکول میں اردو ٹیچر تھے، اُنتیس سال سے تتلی نما مونچھیں رکھے ہوئے تھے جو ہٹلر کے بعد اب ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں اور بقول خود اٹھارہ سال سے کسی نہ کسی درجے میں یہ شعر پڑھاتے سمجھاتے بقول شخصے الجھاتے رہے تھے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

۵ مارچ ۱۹۴۹ء کو نہیں معلوم کیا ہوا کہ پنڈت جی جب پہلے گھنٹے میں درجہ آٹھ کو پڑھانے آئے تو داہنی مونچھ قریب قریب غائب تھی اور بائیں مونچھ بہت چھوٹی اور سُکڑی ہوئی تھی۔ لڑکوں نے پہلے تو تعجب سے آنکھیں پھاڑیں پھر آپس میں کھس پھسائے اور اس کے بعد بے ساختہ ہنسنا اور کھلکھلانا شروع کر دیا۔ پنڈت جی شاید اپنی مونچھوں کی نئی چھاپ سے بے خبر تھے لہٰذا پہلے انھوں نے اپنا سر کھجلایا، ناک مروڑی پھر حسب دستور اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور لڑکوں کی غیر معمولی زندہ دلی کو ان کی عام مروّجہ بدتمیزی پر محمول کرتے ہوئے کتاب کھول کر پڑھانا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس روز کے سبق کا عنوان تھا تندرستی اور وہ اس شعر سے شروع ہوتا تھا۔

تنگ دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

پنڈت جی اٹھارہ سال سے یہ شعر جس طرح سمجھاتے گئے تھے اسی طرح آج بھی سمجھانے لگے "بچو تندرستی ہزار نعمت ہے، ہزار نعمت یعنی بڑی نعمت ہے بہت بڑی نعمت، تنگ دستی کے معنی مفلسی۔ غالب تخلص شاعر کا۔ مقطع میں تخلص آتا ہے شاعر کا تو مطلب یہ ہوا کہ غالب کہتے ہیں کہ اگر مفلسی نہ ہو تو تندرستی ہزار نعمت ہے یعنی بہت بڑی نعمت ہے۔۔۔"

"نعمت خانہ" درجے کے ایک کونے سے آواز آئی "یہ کون؟" پنڈت جی گرجے اور لڑکوں کی طرف دیکھنے لگے، لیکن سب ہی لڑکوں کے منھ بند تھے اور اب یہ پتا

لگانا ناممکن تھا کہ چند لمحے پیشتر کون بولا تھا۔ "مونچھ صاف ہوگئی" کسی کونے سے آواز آئی۔ لیکن "نعمت خانہ" نے پنڈت جی کے خیالات کا تسلسل دفعتاً توڑ دیا اور وہ کچھ بہک سے گئے ۔۔۔۔۔۔

تھوڑے سے سکتے کے بعد انھوں نے ایک بالکل نئے انداز سے اپنی گلفشانی شروع کر دی۔ "بچو! تندرستی کیا چاہتی ہے؟ نعمت خانہ؟ ہاں! ہاں! نعمت خانہ یعنی خوراک نہ صرف خوراک بلکہ کافی خوراک۔ کپڑے! اچھے صحت مند کپڑے مکان، عمدہ ہوادار مکان، تفریح کے سامان وغیرہ وغیرہ اور یہ سب چیزیں کیا چاہتی ہیں۔ مطلب یہ کہ کیسے حاصل ہو سکتی ہیں یعنی یہ کہ کس چیز سے خریدی جا سکتی ہیں؟ روپے سے۔ روپیا ہی صرف روپیا ہی ان چیزوں کو مہیا کر سکتا ہے اور تنگ دستی کے معنی ہیں روپے کا نہ ہونا۔ مفلس ہونا، پھیچر ہونا، فاقہ مست ہونا، ایسی صورت میں ۔۔۔" پنڈت جی کو خود اپنی موزونیٔ طبع پر تعجب ہو رہا تھا اور وہ اس کا اثر لڑکوں پر دیکھنے کے لیے کچھ رک گئے۔ لڑکوں کے چہروں پر غیر معمولی بشاشت دیکھ کر پنڈت جی کچھ کھٹکے لیکن اس وقت ان پر ایک قسم کی الہامی کیفیت طاری تھی اور وہ ایک تازہ جوش کے ساتھ پھر گویا ہوئے "بچو! غالب کا سمجھانا اور سمجھنا بجھانا اور بوجھنا کوئی ہنسی دل لگی نہیں ہے۔

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

"ہاں! بچو! تو میں کہہ رہا تھا کہ تندرستی کا تقاضا ہوتا ہے، تندرستی کے جملہ لوازمات! اور تنگ دستی کا نتیجہ ہوتا ہے ان لوازمات کا عنقا ہونا لہٰذا تنگ دستی اور تندرستی میں آگ اور پانی کا بیر ہوتا ہے ہاں تو شاعر کہتا ہے کہ اگر تنگ دستی نہ ہو تو تندرستی ہزار نعمت ہے"، لیکن لفظ "اگر" سے جو پورے شعر کی جان ہے غالب صاحب نے نقشا ہی پلٹ دیا ۔۔۔۔۔ واہ واہ وا! کیا شعر کہا ہے؟ تھے نہ آخر استاد! کیا صنعت تضاد صَرف کی ہے؟ ہاں تو مطلب یہ کہ تندرستی صرف اسی وقت تک نعمت ہے جب تک تنگ دستی نہ ہو لیکن اگر تنگ دستی ہو تو تندرستی نعمت نہیں بلکہ لعنت ہو جاتی ہے۔" پنڈت جی جس وقت یہ جولانیِ طبع دکھا رہے تھے تو ان کی آنکھیں درجہ پر نہیں بلکہ سامنے والی دیوار کی چھت پر تھیں۔ سانس لینے کے لیے وہ رکے تو ان کی نظریں بھی دیوار سے اتریں اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکوں پر پڑیں۔ انھیں تعجب ہوا کہ لڑکے ان کی اس بے محابا تقریر کو کسی تعجب یا عقیدت سے نہیں بلکہ عام روز مرہ والی لاپروائی اور بے دلی سے سن رہے تھے لہٰذا وہ اپنی کرسی کے سامنے پڑی ہوئی میز پر دو تین غیر ضروری گھونسے مار کر زور سے کھانسے اور آواز کو ذرا بلند کر کے پھر گویا ہوئے۔

"اب شاعر کا کمال دیکھیے۔ افوہ! کیا غضب کا دماغ پایا تھا ظالم نے؟ سچ کہا ہے کسی نے کہ شاعر اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔"

پنڈت جی نے دو لڑکوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا اور غصّے سے چیخے: "رمیش چندر، عبداللطیف کیا سمجھے؟ خاک۔"

"شاعر اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔" رمیش نے کہا۔

"کیا مطلب؟" پنڈت جی گرجے۔

"شاعر جلدی پیدا ہوتا ہے۔" عبداللطیف نے کہا۔

"جی ہاں، وہ نو مہینے کے بجائے آٹھ مہینے میں پیدا ہوتا ہے۔..." "چھی، چھی! غالب اور تمہارے۔ یہ کوڑھ مغزوں کو پڑھایا جائے ظلم ہے ظلم۔ ارے شاعر اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں اپنے سے آگے یعنی اپنے مرنے کے بعد کی باتیں بھی کہہ جاتا ہے۔ کیا سمجھے؟"

"وہ اپنے مرنے کے بعد کی باتیں کہہ جاتا ہے؟" رمیش نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"یعنی وہ اپنے جنازے وغیرہ کی باتیں کہہ جاتا ہے۔" عبدالقدوس نے لقمہ دیا۔

"کیا بک رہے ہو؟ جنازہ چہ معنی دارد۔؟"

"کل ہی تو آپ یہ شعر پڑھا رہے تھے کہ

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

پنڈت جی کا چہرہ غصّہ سے لال چقندر ہو گیا لیکن کچھ لاجواب ہو کر انھوں نے ضبط ہی سے کام لینا مناسب سمجھا۔ "عجیب احمق ہو تم! یہ بالکل دوسری بات ہے۔ بلکہ بہت چھوٹی بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر بلکہ یوں کہو کہ بڑا شاعر اپنے زمانے سے بہت آگے کی باتیں بھی کہہ جاتا ہے۔ مثلاً یہ شعر جو غالب صاحب نے کہا تھا اور میں تم کو سمجھا رہا ہوں اب سے قریب سو سال پیشتر کہا گیا تھا۔ اس وقت نہ قحط تھا نہ گرانی، نہ کنٹرول نہ بلیک مارکیٹ لیکن اس میں ہو بہو موجودہ زمانے ہی کا نقشا کھینچ دیا گیا ہے اور شاعر نے آج کل کی گرانی، بے روزگاری، غلہ کی کمیابی اور صحت کی خرابی کی جیتی جاگتی تصویر اُتار کر رکھ دی ہے۔ اُف۔ اُف!

ع کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا۔

غالب صاحب واقعی غالب ہی تھے اس شعر کے ایک حسن پر تو آج تک کسی شارح نے غور ہی نہیں کیا۔ ظالم نے اپنا تخلص کس خوبصورت سے صَرف کیا ہے۔

ع تنگ دستی اگر نہ ہو غالب

مطلب یہ کہ اگر تنگ دستی حاوی نہ ہو۔ غالب معنی حاوی، غلبہ کرنے والا جیسے شریک غالب۔۔۔ مطلب یہ کہ لفظ غالب شعر کے معنی میں بھی اضافہ کر رہا ہے اور شاعر کا تخلص تو ہے ہی۔ ہاں تو مطلب یہ کہ شعر صاف ہوگیا۔"

"صاف ہوگئی" درجے کے ایک گوشے سے آواز آئی۔ پنڈت جی جھلا کر بولے "شعر مونث نہیں مذکر ہے۔ تم کم بختوں کو تو مذکر اور مونث کی بھی تمیز نہیں۔ کیا سمجھے؟"

پورے درجے نے ایک زبان ہو کر کہا "کچھ نہیں سمجھے۔"

پنڈت جی غصے سے آگ بگولا ہوگئے، پہلو بدل کر کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے اور ایک بالکل نئے طرز سے شعر کو پھر سمجھانا شروع کر دیا۔ "پتھر پڑ گئے ہیں عقلوں پر۔ اجی گیہوں بک رہا ہے روپے کا ڈھائی سیر، خالص گھی روپے کا چار چھٹانک بھی نہیں ملتا، سبزی اور ترکاری جتنی پہلے ایک پیسے کی ملتی تھی اب چار آنے میں بھی نہیں ملتی۔ مطلب یہ کہ یہ سب علامتیں ہیں تنگ دستی کی اور شاعر کہتا ہے جب تنگ دستی نہ ہو تو تندرستی ہزار نعمت ہے، مطلب یہ کہ جب تنگ دستی ہو یعنی جیب میں دام نہ ہوں تو پھر تندرستی نعمت نہیں ہے۔ نعمت نہیں ہے تو لعنت ہے، صاف سا شعر ہے، بالکل صاف!"

"صاف ہوگئی" درجے کے ایک گوشہ سے پھر آواز بلند ہوئی۔

"یہ مونث کون بولتا ہے؟" پنڈت جی گرجے۔

"مونچھ!" ایک آواز سنائی دی۔

پنڈت جی جو اپنی نصف مونچھ کی صفائی سے اب بھی بے خبر تھے کچھ نہیں سمجھے اور تلملا کر کھڑے ہوگئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سارے درجہ کو دیکھنے لگے کہ یہ گستاخانہ اور بے معنی آوازیں کس طرف سے آرہی ہیں۔

"رمیش چندر، عبد اللطیف، نذر حسین، حامد حسین، توقیر محمد، غلام حسین، کامتا پرشاد کھڑے ہو جاؤ۔" اور پھر ان لڑکوں کو سر سے پیر تک گھورنے کے بعد پنڈت جی نے کڑک کر پوچھا "یہ مونچھ کس نے کہا تھا؟"

نامزد لڑکے کھڑے ہوگئے اور ایک زبان ہو کر بولے "ہم نے تو کچھ نہیں کہا پنڈت جی۔"

لیکن ان لڑکوں کے کھڑے ہو جانے سے ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکوں کو خاطر خواہ آڑ مل گئی کیونکہ وہ پنڈت جی کی نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔

"مونچھ صاف ہوگئی! مونچھ صاف ہوگئی!" کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ نامزد لڑکے جو انتہائی معصومیت سے خاموش کھڑے تھے وہ بھی کھلکھلا اٹھے اور ان کے پیچھے تو

باقاعدہ قہقہے لگ ہی رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا درجہ "مونچھ صاف ہوگئی" کے نعروں اور قہقہوں سے گونج اٹھا۔ پنڈت جی مارے غصّے کے آپے سے باہر تھے لہٰذا فوراً اپنا ڈنڈا لے کر لڑکوں پر جھپٹ پڑے۔ پانچ سات کھیت رہے لیکن بیس پچیس بھاگ نکلے۔ اور چونکہ پنڈت جی اپنی "تنگ دستی" "یا" "تندرستی" کے باعث دوڑنے سے معذور تھے لہٰذا بھاگے ہوئے لڑکے مار کھانے سے بچ گئے۔

یہ مذاق ایسا نہ تھا جو صرف درجہ آٹھ تک محدود رہتا چنانچہ تھوڑی دیر میں سارا اسکول اس میں حصّہ لینے لگا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے درجہ آٹھ کے سب طالب علموں کو بلا کر سخت تنبیہہ کی اور اس روز کے لیے پورے درجے کو نہ صرف غیر حاضر کر دیا بلکہ پنڈت جی سے دست بستہ معافی منگوائی لیکن اس کے باوجود اس روز اسکول میں پنڈت جی جدھر بھی نکلتے "مونچھ صاف ہوگئی" کی صدائیں ضرور بلند ہو جاتیں۔

پنڈت جی کے ساتھ اسکول میں، میں بھی ٹیچر تھا اور چونکہ ہم دونوں کے مکانات نزدیک ہی تھے لہٰذا بالعموم ہم لوگ اسکول سے ایک ساتھ ہی واپس آتے۔ اس روز راستے میں پنڈت جی کہنے لگے۔

"میرا ارادہ ہے کہ ایک شرح دیوان غالب لکھ ڈالوں۔"

"ضرور لکھیے۔ لیکن اس کو معنون کس کے نام کیجیے گا؟"

پنڈت جی سر کھجاتے ہوئے بولے "بس یہی تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ اب آپ ہی بتائیے مینجر صاحب کے نام کروں یا ہیڈ ماسٹر صاحب کے نام، جس کے نام نہ کروں وہ ہی خفا ہو جائے گا۔"

"ہاں بات تو ذرا مشکل ہے لیکن دیکھیے مینجر صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب ہم زلف ہیں نا؟"

"ہاں ہاں، ہم زلف تو ہیں بلکہ شاید اسی وجہ سے ہیڈ ماسٹر صاحب کا تقرر بھی ہوا تھا۔"

"تو پھر ان کے مشترکہ خسر صاحب کو یہ شرف کیوں نہ دیجیے؟"

پنڈت جی پھڑک اٹھے۔ "بھئی کیا دور کی کوڑی لائے ہو، میرے دونوں میٹھے۔ لیکن خسر صاحب تو موے آتش دیدہ ہو چکے، مطلب یہ کہ رحلت فرما چکے ہیں۔"

"تو پھر آپ کے انتساب کے بعد ان کے خودکشی کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے زیادہ سے زیادہ انتساب کے نیچے یہ مصرع اور بڑھا دیجیے گا۔

بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

اس سے مینجر صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے بچّے بھی انتساب میں شامل ہو جائیں گے

اور مرحوم کی نا وقت موت بھی آشکار ہو جائے گی۔

" بات تو ٹھیک ہی ہے۔ لیکن مطلب یہ ہے کہ خودکشی والی بات میں سمجھا نہیں مرحوم کا انتقال تو ہیضے میں ہوا تھا۔"

میں گھبرایا کہ کہیں پنڈت جی مجھ سے بھی بدظن نہ ہو جائیں لہذا میں ان کی سُنی بات ان سُنی کر کے بولا " یہ آج مونچھ کا کیا قصّہ ہوا۔؟ کم بخت حجام کو تو ضرور نقش فریادی بنا دیجیے گا۔"

بولے " بھئی سچ پوچھو تو اس میں حجّام کا قصور کم اور غالب صاحب کا قصور زیادہ ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں روز سویرے دیوان غالب پڑھا کرتا ہوں، چنانچہ آج بھی پڑھ رہا تھا اتنے میں رام دین حجّام آگیا۔ میری جو شامت آئے میں نے اسے غالب صاحب کے دو تین شعر سنا دیے، وہ پاگلوں کی طرح ہنستا رہا آخر میں کہنے لگا کہ اتنی بڑی کتاب میں میرے مطلب کا بھی کوئی شعر ہے۔" سوال جا بلانہ تھا لیکن تھا غالب صاحب کو چیلنج ! میں نے کہا لو سُنو : سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا

یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

اس کے پلّے کچھ بھی نہ پڑا اور میں اس کو اس شعر کا مطلب سمجھانے لگا۔ بس غالبؔ اسی اثنا میں اس نے میری نصف مونچھ صاف کر دی۔

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے "

اب میں اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ چکا تھا، میں نے آخری سوال کیا " کیا کبھی حضرت غالب کو بھی ایسے حادثے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یعنی وہ اپنا کلام پڑھ رہے ہوں اور حجّام ان کی مونچھ لے بھاگا ہو۔"

پنڈت جی بڑے جوش سے بولے " یقیناً ! یقیناً ! تب ہی تو یہ شعر کہا ہے :

ہر چند ہوں میں طوطیِ شیریں سخن ولے

آئینہ آہ ! میرے مقابل نہیں رہا

میں ایک آہ کے ساتھ اپنے گھر کے دروازے کی طرف جھپٹا اور ایک " واہ " کے ساتھ اس کو اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

ہاں یہ بھی واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ تنگ دستی اور تندرستی والا معرضِ بحث شعر حضرت غالب کا نہیں بلکہ حضرت سالک کا ہے۔

# گھن چکّر

میرے ایک پروفیسر کو کُتوں سے سخت نفرت بلکہ ان کے نام ہی سے چڑھ تھی لیکن جب ان کے ہمسایے کے کتے نے ان کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں ضرورت سے زیادہ چھیڑنا شروع کر دیا تو مجبوراً انھوں نے بھی ایک بھیانک قسم کا کتا پال لیا تاکہ جس صورت سے ہمسایے کا کتا ان کے لیے خواب پریشان بنا ہوا تھا اسی صورت سے ان کا کتا ہمسایے کے لیے وبالِ جان بن جائے" اور دونوں طرف میں ڈاگ برابر لگے ہوئے والا مضمون درپیش ہو جائے۔ قریب قریب کچھ ایسی ہی صورتِ حال اور اسی قسم کی نیّت سے مجھے گھن چکر جیسے عظیم الشان بور (Bore) سے تعلقات پیدا کر کے انھیں اپنے گھر بلانے کی مجبوری لاحق ہو گئی تھی۔

نام کچھ اور تھا لیکن ان کی لفّاظی، چرب زبانی اور بے پناہ قوّتِ گویائی کے باعث کسی مسخرے نے انھیں گھن چکّر کا لقب دے دیا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ پھر اس کے مقابلے میں ان کا اصلی نام یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ گفتگو کی تیز رفتاری اور خلا میں لامتناہی پرواز کی رعایت سے انھیں راکٹ بھی کہا جا سکتا تھا لیکن غالبًا گھن چکّر کے لقب سے ان کی اس صلاحیت کی طرف واضح اشارہ مقصود تھا کہ وہ گھوم پھر کر دائروں میں گفتگو کرتے اور ایک بات میں سیکڑوں باتیں پیدا کرتے اور آم کی گٹھلی سے جامن کا درخت نکال کر اس میں کھجور کی قلم باندھتے اور اس سے خربوزے توڑ کر سننے والے کو زندگی سے بے زار یا پھر آمادہ بہ پیکار کر دیتے۔ وہ بات شروع کہیں سے کرتے اور ختم — خیر ختم تو وہ کوئی بات کبھی نہ کرتے تھے۔ اسے کداتے پھنداتے، طرح طرح کی قلابازیاں لگاتے اور زمین آسمان کے قلابے ملاتے نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ ان کی ہر بات بچّہ دیتی ہوئی چلتی اور پھر جب بچوں کے بچّے اور ان کے بچّے ضبط تولید کے تمام قیود توڑ کر لاتعداد اور بے شمار ہونے لگتے تو پھر ان کے مورث اعلا کا مفقود الخبر اور سامعین کا مخبوط الحواس ہو جانا نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہو جاتا۔

"گھن چکّر" دنیا کے ہر موضوع پر بلکہ بہت سے موضوعات پر بہ یک وقت ہفتوں

اور بھینوں پے ساختہ اور بے تکان بول سکتے تھے۔ ان کے معلومات کا ذخیرہ ان کی قوت گویائی سے بھی دو چار جوتے آگے تھا۔ کہنے کو تو وہ گریجویٹ تھے اور پچیس سال کا طویل عرصہ انھوں نے علم کی تلاش میں (یا علم نے ان کی تلاش میں) صرف کرکے وہ ایک ننھی منی ڈگری سے بھی سرفراز ہو چکے تھے (یا ممکن ہے کہ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے اس ڈگری کا الزام زبردستی ان کے سر تھوپ دیا ہو) لیکن ان کی بیشتر معلومات ہر قید و بندے آزاد اور طبع زاد بلکہ مادر زاد تھی۔ ان کا سرچشمہ ان کے جملہ حقوق محفوظ، قسم کے ذاتی تجربات اور مشاہدات تھے اور یا پھر ان کی لن ترانیاں اور بد حواسیاں۔

چونکہ وہ ہر موضوع پر یکساں عبور رکھتے تھے لہذا انھیں اپنی گفتگو کا موضوع تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ موضوع کے متعلق وہ شبہہ کا فائدہ ہمیشہ دوسروں کو دیتے۔ لہذا زیادہ تر وہ دوسروں کی گفتگو کے درمیان دخل در معقولات کرتے ہوئے گھس جانے کے عادی تھے۔ کہیں جنازہ رکھا ہوتا اور مرحوم کے اوصاف و خصائل پر روایتی گفتگو ہو رہی ہوتی، وہ پہنچ جاتے تو انھیں اپنے وہ گھن چکریّ جو ہر بلکہ جواہرات دکھانے کے لیے صرف موضوع کی بو سونگھ لینا کافی ہوتا۔ وہ ایک دم سے بیچ پڑتے!
"جی ہاں مرحوم کو آم بھی بہت مرغوب تھے بلکہ سچ پوچھیے تو اسی شوق کی بدولت انھیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔" مرحوم کے اعزا حیرت سے ان کا منہ تکتے رہ جاتے اور آموں کے متعلق ایک مفصل مقالہ پڑھ دینے کے بعد ان کے اقسام بیان کرنا شروع کر دیتے۔ پھر ٹمبکٹو میں آم کی قلمیں لگائے جانے کے امکانات پر قیاس آرائی کرنے لگتے پھر عام جغرافیائی حالات کے ساتھ موسمیات پر جولانی طبع دکھانے لگتے۔ موسمیات کی گفتگو میں مختلف ممالک کے مختلف جو ہری بموں کے اثرات کا ذکر چھڑ جانا ایک قدرتی بات تھی اور پھر ان گلی کوچوں سے کترا کر نکل آنے کے بعد وہ دنیا کی عام سیاسیات کے لق و دق صحرا میں پہنچ جاتے اور یہاں انھیں اپنے راکٹ اسپٹنگ اور جو ہراتی بم چھوڑنے کے بے پناہ موقعے مل جاتے۔

گھن چکر کی یاوہ گوئی اور ہذیان سرائی سے سارا محلہ آسیب زدہ معلوم ہوتا۔ ان پر نظر پڑتے ہی لوگ گھبرا جاتے، ان کے گھر کی طرف تو کسی واقف کار کے رخ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا، کس کی شامت آئی تھی جو آ بیل مجھے مار والی مثل اپنے اوپر صادق کرتا؟ وہ خود جس کے گھر پہنچ جاتے وہ رسیاں تڑانے لگتا اور کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے خود اپنے گھر سے بھاگ نکلتا۔ راستے میں وہ دکھائی پڑتے تو لوگ منہ پھیر کر اور غالباً لاحول پڑھتے ہوئے دوسری طرف چل دیتے۔ غرض کہ

محلّہ بھر انھیں شیطان یا جلّاد سے کم نہ سمجھتا۔ شاید انھیں خود بھی احساس ہو چلا تھا کہ ان کی بے پایاں معلومات سے مستفید ہونے کے بجائے لوگ بھاگتے اور کنائی کاٹتے ہیں لہذا جو کوئی بھولا بھٹکا مسافر، ضرورت مند یا اپنی جگہ سے نہ ہٹ پانے والا دُکان دار انھیں موقعے سے مل جاتا تو وہ اپنی زبان کی ورزش کی پوری کسر اسی غریب سے نکال لیتے اور اس پر اپنے معلومات کے ٹوکرے دن پر ٹوکرے انڈیل کر اپنی زبان کی مقرّرہ استعمال میں ہرگز کوئی فرق نہ آنے دیتے۔

ایسی یگانۂ روزگار ہستی سے دوستی کرکے میں نے جو تاریخی حماقت کی اس کی ذمہ داری میرے گھر کے جغرافیے پر تھی جو حد سے زیادہ غلط قسم کا واقع ہوا تھا۔ میرے گھر کے دائیں جانب ایک میر صاحب رہتے جو افیون کے شہید ہونے کے علاوہ میر تقی میرؔ کے بڑے شیدائی تھے۔ اور بائیں جانب ایک مرزا صاحب رہتے جو کبوتروں کے عاشق زار ہونے کے ساتھ مرزا غالب کے زبردست طرف دار تھے۔ ان دونوں کے درمیان یہ بحث مسلسل سولہ سال سے چل رہی تھی کہ میر اور غالب میں کون بڑا شاعر ہے اور اس سلسلے میں اپنے اپنے امیدوار کو اونچا کرنے اور آگے بڑھانے سے زیادہ ان کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے کے امیدوار کی پگڑی اچھال کر اس کی ٹانگ گھسیٹ لی جائے۔ اگر ایک غالب کو شعریت سے عاری اور مہمل گو کہتا تو دوسرا میرؔ کو ایذا پسند اور مبتذل گو گردانتا بلکہ شاید ہی کوئی ایسا الزام باقی رہ گیا ہو جو آئے دن ان عظیم المرتبت لیکن قابلِ رحم شعرا پر حملے یا جوابی حملے کے طور پر ایک افیونی اور دوسرے کبوتر باز کی جانب سے نہ تراشا جاتا ہو۔ یہ بحث جتنی طویل سے طویل تر اتنی ہی تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی۔ بار بار آستینیں چڑھ چکی تھیں اور اکثر تھوڑا بہت دھول دھپّا بھی ہو چکا تھا۔ لیکن دونوں عادت سے مجبور رہتے اور روزانہ بلا ناغہ آپس میں بحث کیے بغیر شاید زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے۔ اب شومیِ قسمت سے میرا مکان دونوں حضرات کے مکانوں کے درمیان میں واقع ہوا تھا لہذا دونوں نے میرے ہی گھر پر اکھاڑا قائم کر رکھا تھا۔

آندھی آئے، پانی برسے یا لُو چلے، سویرا ہوتے ہی دائیں جانب سے میر صاحب اور بائیں جانب سے مرزا صاحب لپکتے جھپکتے آتے اور میرے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر آکر آمنے سامنے رونق افروز ہو جاتے پہلے کچھ افیون کی گرانی اور کبوتروں کی بے وفائی پر ہلکا پھلکا تبصرہ ہوتا، پھر میر صاحب میر تقی میرؔ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھتے اور غالبؔ پر کچھ چھینٹے کستے۔ اس پر مرزا صاحب فوراً آتش زیر پا ہو جاتے اور غالبؔ کی مدح سرائی کے بعد میرؔ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے۔ پھر دونوں میں اس قسم کے اشعار کا تبادلہ ہوتا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا۔ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ اس شاعری میں عزتِ سادات بھی گئی
اب گویا بارود میں چنگاری پڑ جاتی۔ دونوں میں کچھ ایسی ہم رخ ٹھنتی جیسے کسی بند جگہ پر دو گئے لڑ نہیں بلکہ ڈنڈوں سے مارے جا رہے ہوں۔ ایسے موقعے پر بعض دنیا سازی سے مجھے درمیان میں جانا پڑا۔ ”اجی ہٹائیے اس بحث کو۔ بتائیے آپ حضرات چائے پییں گے یا شربت؟“

”میر صاحب بولتے ”چائے!“ مرزا صاحب کہتے ”شربت!“

میں اس امید پر گھر کے اندر چائے اور شربت کے انتظام میں بھاگ جاتا کہ جب تک لوٹ کر آؤں گا یہ حضرات سر پھٹول کر کے اسپتال یا حوالات روانہ ہو چکے ہوں گے لیکن پلٹ کر آتا تو دونوں کو سرخ چہروں اور چڑھی ہوئی آستینوں کے ساتھ اپنی اپنی کرسیوں پر بدستور چپکا اور غراتا ہوا پاتا۔ چائے اور شربت کی موجودگی میں بحث کچھ دائرۂ اعتدال میں آ کر ایک دوسرا رخ اختیار کر جاتی۔

مرزا صاحب: اجی کیا شعر کہہ دیا ہے غالب لاجواب نے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر صاحب: ”غالب طرفدار ضرور ملے لیکن افسوس سخن فہم کبھی نصیب نہ ہو سکے آپ یہ شعر پڑھ کر صرف اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ غالب نے خدائے سخن میر کے کلام سے کیسی کیسی چوریاں اور خوشہ چینیاں کی ہیں۔

مرزا صاحب: اجی کیا کفر بک رہے ہیں آپ؟ غالب، اور میر کی خوشہ چینی! خود لعل اور جواہر لٹانے والا بازار کے ٹھیکروں پر نظر بھی نہیں ڈال سکتا۔

میر صاحب: بس! بس! زبان نہ کھلوائیے۔ چار جزو کا دیوان اور اس میں بھی مانگے تانگے کا سامان! اب آپ کا پڑھا ہوا غالب کا شعر میر کے اس شعر کا چربہ نہیں تو اور کیا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا

مرزا صاحب: (قہقہہ لگاتے ہوئے) بس حد کر دی قبلہ آپ نے لعل و جواہر ہمیشہ ریت میں ہی ملتے ہیں۔ کنکر پتھر کی طرح اُن کے چھٹے نہیں لگائے جاتے۔ اب آپ کو غالب کا ہر شعر میر کے کسی نہ کسی شعر کا چربہ نظر آتا ہے تو معاف کیجیے گا اس میں غالب کا نہیں آپ کی سخن فہمی کا قصور ہے۔ انہیں اشعار میں دیکھیے کہاں حضرت غالب کا شیر اور کہاں بے چارے میر کی بکری۔

میر صاحب: اجی حضرت! قصور معاف! میر کا شعر آپ کی فہم سے بالاتر ہے۔ غالب کا شعر

اس کے پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی کو سرقۂ مذموم کہتے ہیں۔

مرزا صاحب: جی ہاں محترم یہ سرقۂ مذموم نہیں بلکہ شکوۂ مغموم ہے۔ میرؔ کے شعر میں لفظ انتظار نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ ہم خود اپنا انتظار کر رہے ہیں تو اس میں وارفتگی، ربودگی اور محویت کیا باقی رہی؟

اور پھر اس شدّت سے دونوں اشعار کی باریکیوں پر بحث کیا، جنگ و جدال ہونا کہ ان دونوں ہی اشعار کا اطلاق ہمارے ایسے مظلوم اور مجبور سامع پر ہونے لگتا۔

یہ بحث کچھ دھیمی پڑنے لگتی تو میر صاحب کوئی نیا شگوفہ چھوڑ دیتے "لیکن حضرت میرؔ نے غالب کی طرح ایسے مہمل اور سنگلاخ اشعار کبھی نہیں کہے

؎ شوخیِ نیرنگ صید وحشت طاؤس ہے دام سبزہ میں ہے پرواز چمن تسخیر کا"

مرزا صاحب: حضور والا۔ یہ تو ادبِ عالیہ ہے۔ غالبؔ، جہلا کے لیے میرؔ کی طرح ایسے مبتذل اشعار کبھی نہیں کہتے تھے۔ ؎

آشنا ڈوبے بہت اس دور میں گرچہ جامہ یار کا کم گھیر ہے

اب اسی نئی بحث کا خاتمہ اس وقت تک نہ ہوتا جب تک میر صاحب کو اپنی افیون اور مرزا صاحب کو اپنے کبوتر یاد نہ آجاتے اور جب بادلِ ناخواستہ یہ دونوں حضرات دوسرے دن آکر اپنے اپنے مخالف شاعروں کے پُرزے اُڑا ڈالنے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو سدھارتے تو میرا دماغ قریب قریب ماؤف ہو چکا ہوتا اور دوسرے دن کے لیے زندہ رہنے کی کوئی تمنّا میرے دل میں باقی نہ رہتی۔

سخت عاجز کر رکھا تھا اس جوڑی نے اپنی بکواس سے! کوئی دوسرا مکان ہی نہیں ملتا ورنہ میں تو ایسے مکان پر، جو ہمیشہ دو غنیموں کا میدان جنگ بنا رہتا لعنت بھیج کر نہیں معلوم کب کا بھاگ چکا ہوتا۔

یہ حالات تھے جن کے ماتحت مجھے طوعاً و کرہاً گھن چکر کو اپنے گھر بلانا پڑا ان کے لیے مشہور تھا کہ وہ نہیں معلوم کتنی محفلیں درہم برہم کر چکے اور ایک مرتبہ جب وہ ایک ایسے کلب کے ممبر ہو گئے تھے کہ جس کے ممبر قریب پچاس کے تھے تو ایک ہی ماہ بعد وہ صرف تنہا ممبر رہ گئے تھے۔

میر صاحب اور مرزا صاحب حسب دستور تشریف لا کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور چونکہ ان دونوں ہی بزرگوں کو یہ غلط فہمی لاحق تھی کہ میں ان کی ہرزہ سرائی اور اپنے تضیع اوقات سے ضرورت سے زیادہ مستفید اور محظوظ ہوتا ہوں، لہذا معمول کے مطابق بحث کے آغاز میں مجھ سے رسمی چھیڑ چھاڑ، افیون اور کبوتروں کا

تبرکاً کچھ تذکرہ کرنے کے بعد وہ اپنے اپنے مورچوں پر ڈٹ گئے اور لگے غالب اور میرؔ کے قلعوں پر گولہ اندازی کرنے۔ ۔اور پھر ایک دم سے بلائے ناگہانی کی طرح "گھن چکر" نازل ہو گئے!

قاطع اعمار ہیں اکثر نفوس ۔ وہ بلائے ناگہانی اور ہے

انھوں نے خود دم لینے کے لیے میرؔ صاحب اور مرزا صاحب کو چند لمحوں کا موقع دیا اور پھر وہ ان دونوں پر بیک وقت ایسا جھپٹے جیسے کسی بھوکے کتے کو دو رسیلی ہڈیاں ساتھ ساتھ مل جائیں۔

گھن چکرؔ چیخے !" اجی یہ آپ لوگ کیا گڑی ہوئی ہڈیاں نکال نکال کر چچوڑ رہے ہیں۔ میرؔ اور غالبؔ کو اپنی اپنی جگہوں پر چھوڑیے میں نے تو اگر کسی شاعر کو واقعی شاعر پایا تو وہ حضرت سلفہؔ تھے۔ کیا دماغ پایا تھا ظالم نے۔ وہ شعر کہتا نہیں بلکہ ڈھالتا تھا اشاروں اشاروں میں ایسے پتے کی بات کہہ جاتا تھا کہ بس داد دیتے دیتے جان دے ڈالنے کو جی چاہنے لگتا ہے

کبھو میں کسو سے نہ شکوہ کروں گا ۔ جو سلفہ بھروں گا تو سلفہ پیوں گا

اب اسی شعر میں، جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول کو تخلص کے شاہ کار تصرف کے ساتھ کس دلآویزی سے بیان کر دیا ہے کم بخت نے کہ بس واہ! وا۔ نہیں معلوم کونسی مشین لگی تھی اس کے دماغ میں۔ ادھر اس کے کان میں نشر ڈال دیجیے اور ادھر فوراً اس کے منہ سے نظم اگلوا لیجیے۔ ناہنجار کو بکریاں پالنے کا بھی غضب کا شوق تھا۔ ایک روز میرے ساتھ تیتر کا شکار کھیلنے گیا۔ اور پھر جو گھن چکرؔ کی چرخی چلی ہے تو میرؔ صاحب اور مرزا صاحب منہ کھولنے کو ترس گئے۔ گھن چکر کی گفتگو کے عنوانات کچھ اس قسم کے تھے۔

ارادہ کرنا گھن چکرؔ اور سلفہ کا شکار کا۔ تیاری شکار مع انتظامات بالتفصیل بحث درمیان گھن چکر و زوجہ گھن چکرؔ بابت اقسام طعام ناشتہ، فضائل کدو بہ زبان زوجہ گھن چکرؔ۔ فضائل بیگن بہ زبان گھن چکرؔ۔ کھو جانا، بندوق گھن چکر کی بر وقت روانگی شکار۔ تلاش بندوق مع مکالمات متفرقہ۔ خانہ تلاشی سلفہ کے گھر کی۔ مل جانا بندوق کا ایک نالی میں۔ مکالمہ گھن چکرؔ برادر سلفہ بابت سرقہ بندوق بالفاظ تلخ و ترش، یاد دلانا سلفہ کا گھن چکر کو بابت دینے بندوق عاریتاً۔ روانہ ہونا گھن چکر اور سلفہ کا سفر شکار پر مع قطعۂ روانگی مصنفہ سلفہ۔ مصائب سفر بالتفصیل و با تصویر مع لطائف و ظرائف۔ پہنچنا ایک جنگل میں اور دکھائی پڑنا ایک حسینہ کا۔ لپکنا شکاریوں کا جانب حسینہ اور آجانا درمیان میں ایک ریچھ کا۔ بھاگنا سلفہ کا مع بندوق و ناشتہ دان، ٹڑنا

گھن چکر کا کشتی ریچھ سے۔ تفصیلات داؤ پیچ کشتی کے۔ مارا جانا ریچھ کا اور واپس آنا سلفہ کا ایک درخت کے اوپر سے۔ لگنا بھوک کا گھن چکر کو اور خالی پانا ناشتہ دان کو شرمندہ ہونا سلفہ کا اور کہنا قطعۂ وفات ریچھ کا۔

میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کرسیاں چھوڑ کر بھاگ نکلے دوسرے روز پہلے مرزا صاحب آتے دکھائی دیے لیکن انھوں نے گھن چکر کو میرے برآمدے میں دیکھ کر الٹے پانوں بھاگنا شروع کر دیا۔ گھن چکر نے آواز دے کر انھیں بلایا بھی لیکن انھوں نے یہ کہتے ہوئے اپنی واپسی کی رفتار اور بھی تیز کر دی "کیوں نہ بھاگوں کہ یاد کرتے ہیں"

دوسری جانب سے میر صاحب آ رہے تھے۔ انھوں نے جو گھن چکر کو "مرزا صاحب" پکارتے سُنا تو یہ سمجھ کر کہ "یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے"۔ فوراً ایک قریبی گلی میں مفرور ہو گئے۔

مجھے میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں سے نجات تو حاصل ہو گئی لیکن اب روز علی الصباح جب گھن چکر آ کر میرا دماغ روئی کی طرح دھنکتے اور میرے ہوش و حواس کے سلفے بھر بھر کر پیتے ہیں تو مجھے اپنے وہ بچھڑے ہوئے بزرگ بہت یاد آتے ہیں ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پاؤں

# تکلّف اور تکلیف

تکلّف برطرف استاد ذوقؔ کا یہ شعر ؎

اے ذوقؔ تکلّف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ جو تکلّف نہیں کرتے

تکلّف کے خلاف ایک عام نعرۂ بغاوت بلند کر کے تکلّف کرنے والوں کے ذاتی مفاد کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے، لیکن عام سماجی مفاد کو بڑے پُر تکلّف انداز سے پس پشت ڈال دیتا ہے۔ تکلّف کرنے والے یقیناً تکلیف اٹھاتے ہیں لیکن بیشتر وہ اپنے تکلّف سے اپنے مخاطب کو بعض بڑی زحمتوں اور پریشانیوں سے بچا بھی لیتے ہیں برخلاف اس کے بے تکلفی برتنے والے آرام تو یقیناً اٹھاتے ہیں لیکن عموماً وہ اپنی بے تکلفیوں کے ہاتھوں اپنے ہدف کے لیے اسی کی زندگی اس قدر دو بھر کر دیتے ہیں کہ بعض اوقات وہ بے چارہ ، نقصان مایہ اور شماتتِ ہمسایہ ، کے مدارج طے کرنے کے بعد کسی غیر قانونی فعل کا مرتکب ہو کر اپنے جیل چلے جانے کے امکانات پر بھی غور کرنے لگتا ہے۔

تمثیلاً میرے دو کرم فرماؤں کا کردار ملاحظہ ہو۔ میرے جب ایک انتہائی پُر تکلّف دوست گرجا شنکر جی میرے غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں تو میرے ان کے درمیان کچھ اس قسم کا مکالمہ درپیش آتا ہے۔

"چائے حاضر کروں ؟"

"جی نہیں ۔"

"کچھ ناشتہ پھل وغیرہ ؟"

"معاف کیجیے گا۔ شکریہ !"

"اچھا تو شربت ہی پی لیجیے ۔"

"ڈاکٹر نے شکر منع کر رکھی ہے ۔"

"برف کا پانی ؟"

"میں برف پیتا ہی نہیں۔"
"تو پھر تھوڑا سا گرم پانی ہی پی لیجیے۔"
"اب آپ کا اس قدر اصرار ہے تو منگائیے آدھا گلاس۔"
اور اس طرح محض تکلّف کی خاطر گرجا شنکر جی آدھا گلاس گرم پانی حلق سے اُتار کر اپنا کلیجہ گرم کر لیتے ہیں اور میں فرائضِ مہمان نوازی سے بحسن و خوبی سبکدوش ہو جاتا ہوں۔

برخلاف اس کے میرے جب ایک انتہائی بے تکلّف دوست پنڈت اُدھم پرشاد بقول اپنے میرے "دولت خانے" پر بلائے بے درماں کی طرح آ پہنچے ہیں تو ایک بالکل ہی دوسرا سماں کھنچ جاتا ہے۔
"لو بھئی ہم آ گئے، کہاں سے چائے وائے؟"
"گرمیوں میں چائے پینا چھوڑ دیا ہے میں نے۔"
"چہ خوش! گرمیوں ہی میں تو چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ چائے منگاؤ مگر ذرا جلدی اور ہاں سوکھی ساکھی چائے خشکی کرتی ہے۔ انگنے حلوائی کی دُکان پر تازہ امرتیاں اور رس گلّے بن رہے ہیں بس تھوڑے سے منگا لو۔"
"چائے کے بجائے شربت نہ پی لیجیے آج؟"
"ہاں! ہاں! شربت میں کیا مضائقہ ہے۔" پنڈت جی فرطِ مسرت سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتے ہیں۔
"چائے اور مٹھائی کے بعد کچھ آم کھائے جائیں اور لیمو کا ٹھنڈا شربت پیا جائے"
"لیکن پنڈت جی! اس گرمی میں بازار کون جائے اور امرتیاں رس گلّے آم لیمو اور برف کیسے لائے؟"
"اس کی تم فکر نہ کرو، میں کلّو کو ساتھ لایا ہوں۔" اور یہ کہہ کر پنڈت جی "کلّو! کلّو!" چیختے ہیں اور ان کا ملازم کلّو جو شاید دروازے میں چھپا کھڑا تھا کالے دیو کی طرح آ موجود ہوتا ہے۔

اب ایسے نازک موقع پر جبکہ دن میں تارے نظر آ جانے کا مضمون درپیش ہو جاتا ہے، تو مجھے رہ رہ کر یہی شبہ ہونے لگتا ہے کہ اُدھم پرشاد جی جو تکلّف کے پیچھے ڈنڈا لیے گھومتے ہیں شاید استاد ذوق ہی کے بھڑکائے ہوئے ہیں اور مجھے حضرت غالب پر رشک آتا ہے کہ انھوں نے کس طرح اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنے کسی بے تکلّف دوست سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

لیکن میں خود شاید تکلّف سے بے تکلفی پر اُتر آیا ہوں۔ تکلّف کرنے والوں کو تکلیف ضرور ہوتی ہے اور عموماً خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ تکلّف ہمیشہ آورد ہوتا ہے اور جو خلوص، ندرت اور بے ساختگی آمد میں ہوتی ہے وہ بھلا آورد کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے ؎

تکلّف سے بَری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں، گل بوٹا کہاں ہے

لیکن ہمارے مجلسی تعلقات کی ضمن میں تکلّف کا لفظ جن دیسع مخصوص اور متضاد معنی اور مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے، ان کی بنا پر یہ لفظ ان چند نادر الفاظ کی برداری میں شامل ہو چکا ہے کہ جن کے معنی سمجھے کم اور محسوس زیادہ کیے جاتے ہیں اور کبھی تو اس کے معنی شرافت، عالی ظرفی اور کسر نفسی لیے جاتے ہیں اور کبھی یہ جھوٹ فریب اور بچھورے پن کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تکلّف کی تعبیر کا بیشتر انحصار تکلّف کرنے والے کی نیّت، کردار اور یا پھر موقع اور محل پر ہوتا ہے استاد ذوق نے تکلّف کو تکلیف کے مترادف قرار دے کر اس سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے لیکن انھیں کے شاگرد حضرت داغ نے تیور بدل کر کہا ہے:

ع اے داغ تکلّف ہے شرافت کی نشانی

مطلب یہ کہ تکلّف میں تکلیف ہوتی ہے تو ہوا کرے لیکن اس سے ہاتھ دھونا گویا شرافت کو خیرباد کہنا ہے۔ دو مُلاؤں میں مرغی حرام ہو کر خطرے سے باہر ہو جانا سنا تھا لیکن دو شاعروں کے درمیان تکلّف کا خطرے میں پڑ جانا خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

استاد ذوق کے ہمنوا ہو کر حضرت شادؔ نے کہا ہے ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لیکن مصیبت یہ ہے کہ شاعر والا تبار کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے اگر ایک سے زیادہ حضرات تیار ہو جاتے ہیں تو پھر مینا کے بطور مالِ غنیمت مل جانے کے امکانات قریب قریب معدوم اور خود اپنی لوٹبی کے اڑن تشتری بن کر غائب ہو جانے کے امکانات قوی ہو جاتے ہیں۔

تکلّف کے مفہوم کی بحث میں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک صاحب اپنی جدّت طرازی کے ہاتھوں، شیخ سعدی کا یہ مصرع

ع تکبّر عزازیل را خوار کرد

یوں پڑھا کرتے تھے ع "تفکّر عزازیل را خوار کرد"۔ لیکن پھر جب ایک دفعہ وہ اپنی سسرال میں تکلّف کے ہاتھوں بھوکے رہ گئے اور رات کو جب تلاش معاش میں چلے اور نعمت خانے کے دھوکے میں ایک نامحرم کے پلنگ سے ٹکرا کر انتہائی مشتبہ حالت میں پکڑ لیے گئے تو انھوں نے اپنے اس نئے تجربے کی روشنی میں اس مصرع میں یہ ترمیم کر لی تھی۔
"ع تکلّف عزازیل را خوار کرد"۔ اور اس طرح خلوئے معدہ اور عزازیل کی صحبت میں بے چارے تکلّف کی بھی مٹی پلید ہو گئی تھی!

تکلّف کی ابتدا عموماً تصنّع، حجاب یا پھر تملّق سے اور انتہا بیشتر حماقت، ندامت بلکہ عداوت پر ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی بے تکلّف ماہر نفسیات اس کو ذہنی بیماری یا پیچیدگی سے تعبیر کرے لیکن در حقیقت یہ علم مجلس کا ایک بہت لطیف اور نازک فن ہے۔ ہر فن کی طرح اس کو بھی حاصل کرنے کے لیے رہبر اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ نااہل کے ہاتھوں یہی فن پھوہڑپن کہلانے لگتا ہے اور "پہلے آپ"، "جی نہیں پہلے آپ" میں گاڑی چھوٹ جاتی ہے اور صاحب کمال کی توجہ سے اس میں چار چاند لگ کر اسے فنِ عالیہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے جس کی سند میں غالباً حضرت غالب کا صرف یہ شعر کافی ہے۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے
تکلّف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی!

تکلّف خواہ وہ داماد کا سسرال میں ہو، خواہ شاعر کا مشاعرے میں، خواہ رائے دہند کا الکشن میں، خواہ دوکاندار کا چور بازاری میں اس کا اصل لطف اس وقت آتا ہے جب دو برابر کے تکلّف کرنے والوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ ان کا ایک دوسرے پر تکلّف دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ٹینس کا کوئی میچ دیکھ رہے ہیں۔ دونوں کے درمیان ٹینس کے گیند کی طرح تکلّف بڑی دیر تک اچھلتا رہتا ہے۔ شکوے اور شکایتیں کی جاتی ہیں، قسمیں دلائی جاتی ہیں اور پھر آخر میں کوئی ایک جل کر کہتا ہے "خوب جانتا ہوں کہ تکلّف کر رہے ہیں آپ" اور دوسرا کلّہ بہ کلّہ جواب دیتا ہے "جی نہیں تکلّف تو در اصل آپ فرما رہے ہیں"۔ مطلب یہ کہ ایک کہتا ہے کہ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں" اور دوسرا کہتا ہے کہ "پہلے آپ" یعنی ابتدا آپ ہی نے فرمائی تھی اور جوتیوں میں دال بٹنے کا لطف آ جاتا ہے۔

تکلّف میں سراسر تکلیف ہونے کے متعلق اگر آپ کو واقعی کوئی شبہ ہو تو میرے دوست رحیم بخش سے ملیے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ دنیا کے بہت سے کام محض تکلّفاً کرنے کے عادی تھے لیکن ایک روز انھیں اپنے "تکلّف" اور "تکلّفاً" کی جی بھر کر داد مل گئی۔ ہوا یہ کہ وہ اپنی سسرال پہنچے اور جب ان سے کھانے کا اصرار کیا گیا تو انھوں

نے "محض "تکلّفاً" یہ ہوائی اڑادی کہ ان کی داڑھ میں اتنا شدید درد ہے کہ پورا سر پھٹا جارہا ہے۔ انھیں خبر نہ تھی کہ کسی زمانے میں ان کے خسر "ماہر دنداں" بھی رہ چکے تھے بلکہ دنداں سازی کی دکان کا بچا کھچا فرنیچر اور آلات حرب و ضرب اب بھی گھر ہی میں موجود تھے۔ چنانچہ جب ان کو ایک مخصوص کرسی پر نیم دراز کرکے ان کے خسر نے ان کی زیرِ بحث داڑھ کا بغور معائنہ کیا تب بھی وہ نہ سمجھے کہ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

اس توجّہ کو شفقت خسری پر محمول کرکے وہ تکلّفاً کچھ اور کراہنے لگے لیکن پھر جب خسر صاحب کے اشارے پر ان کے تین قوی ہیکل لڑکوں نے رحیم بخش کو شکنجے میں جکڑ لیا اور خود خسر صاحب اپنا زنگ آلود زنبور لے کر ان کی طرف بڑھے تو وہ کچھ سمجھے اور اس وقت بہت پھڑکے بلکہ پھڑکے چیخے چلّائے، خوشامد کی اور شاید اپنے تکلّفات کی معذرت بھی کی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ منہ میں ایک آلہ ڈال دینے سے ان کی آواز بند کر دی گئی اور ان کا منہ کھُلے کا کھلا رہ گیا اور پھر زنبور کے چند ہی پیشہ ورانہ جھٹکوں میں ان کی اچھی بھلی داڑھ ان کے منہ سے باہر تھی ... اور غالباً یہ ان کی عقل داڑھ تھی، کیونکہ اس کے نکل جانے کے بعد رحیم بخش نے اس روز اپنی سسرال میں بڑی بے عقلی کی باتیں کیں، بلکہ صاف صاف یہ کہ وہ اودھم اور بلوا مچایا کہ بس

خشک تکلّفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں
چشمک بے دریغ تھی شکوۂ بے حجاب تھا

# آنا اتوار کا

اتوار کیا آتا ہے، ہمارے اور شاید ہمارے جیسے بہت سے بھلے آدمیوں کے لیے ایک ادبارِ گراں بار آتا ہے۔ اس دن نہ صرف ہفتے کے چھے دنوں کے "کردہ گناہوں" کی سزا مل جاتی ہے بلکہ بہت سے "ناکردہ گناہوں" کی حسرت کی داد بھی حاصل ہو جایا کرتی ہے۔

ایک مدت سے آرزو ہے کہ اتوار ہو اور ہم (موسم کی رعایت سے لحاف کے اندر یا کولر کے نیچے) ایک عجیب خود سپردگی کے انداز سے لیٹے ہوئے ہوں۔ سارے گھر پر ایک کیف آور سکوت طاری ہو۔ بیوی بچے میٹنی شو دیکھنے گئے ہوں۔ ہماری من پسند کتابیں اور رسالے ہمارے سرہانے رکھے ہوں اور ہم موکلوں، بنیوں اور بزازوں کی فکروں سے آزاد کبھی چٹکی بجا، بجا کر اپنی بے سُری لیکن بے خطرنے میں اس قسم کے اشعار گنگنانے لگیں ؎

آ زندگی کے نام پر نغمے لٹائیں دوست۔ اور اس سے بے نیاز کہ نام ونشاں رہے

اور کبھی کچھ پڑھنے لگیں، اور جب جی چاہے تو سو بھی جائیں۔

لیکن، اجی تو بہ کیجیے! یہ منہ اور مسور کی دال؟

ہم اور سکون اور پھر اتوار کو؟ چھ روز تو کسی نہ کسی طرح سے اتوار کے سہارے گزر جاتے ہیں اور ہم اتوار کو اپنا پاسبان بنائے رکھتے ہیں لیکن ساتویں روز جب خود یہی پاسباں ہمارا دشمنِ جاں اور غارت گرِ ایماں بن کر ہم پر حملہ آور ہوتا ہے تو:

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

سوموار سے سنیچر تک ہم کسی طرح اتوار کی امید پر جیتے ہیں اور پھر اتوار کو کس دھوم دھام سے ہمارا جنازہ اٹھتا ہے اس کا کچھ ہلکا سا اندازہ محض ہماری ایک ہی اتوار کی سرگذشت سے ہو سکتا ہے

ع ... دل صاحبِ اتوار سے انصاف طلب ہے

ہم اپنے موکلوں کی چخ چخ، بخ بخ سے اپنا دماغ روئی کی طرح دھنکوانے کے بعد کچہری جانے سے قبل کھانا کھانے گھر میں جانا ہی چاہتے تھے کہ شری ہڑبونگ داس

کا غذات کا ایک موٹا سا پلندا بغل میں دبائے آپہنچتے ہیں اور کرسی پر بے تکلفی سے کچھ اس انداز سے بیٹھتے ہوئے کہ گویا دنیا بھر کی گھڑیاں بند ہو گئی ہیں اور وقت نے آگے کو بڑھنا موتوف کر دیا ہے، وہ اپنی فطری بد تواسی کے ساتھ کہنے لگتے ہیں" بابو جی! میرے چچا رام داس جی نے جو مکان ٹھاکر بسنت سنگھ سے مول لیا تھا اور جس کو میرے پتا شیام داس جی نے پنڈت کرشن کمار کے پاس رہن دخلی رکھا تھا اور جس کو میرے بھائی گھنشیام داس نے پنڈت کرشن کمار کے داماد منگل پرشاد سے فک رہن کرالیا تھا اور جس کا مقدمہ میونسپلٹی سے لڑ کر میں جیت گیا تھا' وہی مقدمہ کہ جس میں انجینیر کو تین سو روپے رشوت دینے پڑے تھے اور جس کے متعلق .... حالانکہ ..... چونکہ ... چنانچہ اس مکان کی پچھمی دیوار تیور س سال آندھی میں گر گئی تھی' اس دیوار کے سامنے جو افتادہ زمین پڑی ہوئی تھی اور جس کے بیع بالوفا کے لیے میرے بھتیجے چھبیلے داس نے ہائی کورٹ میں ایک اپیل بھی دائر کر رکھی ہے' اس کو لالہ پکوڑی مل نے خرید کر عدالت کے حکم امتناعی کے باوجود اس پر اپنا چار منزلہ مکان بنانا شروع کر دیا ہے' اور اس لالہ کے بچّے نے عین ہماری ٹٹّی کی طرف اپنی کھڑکیاں قائم کر دی ہیں' چھبیلے داس نے اس کے خلاف عدالت دیوانی میں ایک دوسرا دعوا بھی دائر کر دیا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے کاغذات دیکھ کر خود چھبیلے داس پر ایک اس قسم کی نالش کر دیجیے کہ لالہ گھنشیام داس نے اس کو گود ہی نہیں لیا تھا' اور اگر گود بھی لیا ہوتا تو بھی بوجہ اس کے ہمارے باباسیٹھ بھگت داس نے اپنی ساری جایداد شری ٹھاکر جی کے نام سنکلپ کر دی تھی اور لہذا چونکہ چنانچہ .......

بڑبونگ داس اپنے پیٹ کی کسی تکلیف کی وجہ سے پہلو بدلنے کے لیے کچھ رکے تو ہم فوراً بول اٹھے " بہت ناوقت ہو گیا ہے آج لالہ جی! کچہری جانے کا وقت ہو گیا ہے، شام کو نہ دیکھ لوں آپ کے یہ کاغذات ؟

" جی ہاں کچہری کا وقت تو آگیا ہے لیکن میں دم بھر میں سمجھا دیتا آپ کو۔ یہ کاغذات منہ زبانی، اور یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ پہلے آج دعوا دائر کر دیجیے اور پھر اطمینان سے سمجھ لیجیے گا ان کو۔

" دعوا لکھنے میں بھی کچھ دیر لگے گی آخر؟ شام کو تشریف لے آئیے گا۔

" شام کو تو میں جا رہا ہوں ہاپڑ! خیر اگلے روز اتوار کو دیکھا جائے گا۔ اس روز آپ کو چھٹی بھی ہو گی اور میں ہاپڑ سے لالہ گھنشیام داس کا گودنامہ بھی آپ کو دکھلانے کے لیے لیتا آؤں گا۔

" بہت اچھا" کہہ کر اور اپنے آیندہ اتوار کی شہادت کا ماتم کرتے ہوئے ہم گھر

کے اندر بھاگتے ہیں اور پیچھے پیچھے بڑبونگ داس کی یہ آواز ہمارا تعاقب کرتی رہتی ہے "تو اتوار کو سویرے ہی آجاؤں گا بابوجی! اور ہاں وکیل صاحب محلے کا معاملہ ہے یہ کام آپ کو یوں ہی کرنا پڑے گا۔ البتہ مقدمہ جیت جائے تو منہ میٹھا کردوں گا آپ کا۔"

مٹھائی کے اس مژدے سے ہم جو نوالہ کھا رہے تھے وہ ہمارے منہ میں کڑوا ہوگیا۔۔۔ لیکن خیر، اتوار کو!

شام کو ہم دن بھر کے تھکے ماندے بہت ہلکا دماغ اور اس سے ہلکی جیب لیے گنگناتے اور آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے جارہے ہیں کہ عبدالقدوس، روح القدس کی طرح دفعتاً بڑے ڈرامائی انداز سے سڑک پر نمودار ہوتے ہیں، غالباً وہ جگدیش بابو کے یہاں تاش کھیل رہے تھے اور محض پان کی پیک تھوکنے جو کہ ان کی ایک جبلّی عادت ہے، وہ باہر نکل آئے تھے۔ پیک تھوکنے کے بعد وہ ہاتھ کے اشارے سے ہمیں روک لیتے ہیں۔ "وکیل صاحب آخر وہ درخواست کب لکھیے گا آپ؟" ہم ان عبدالقدوس کی مفتی اور بے سروپا درخواستیں لکھتے لکھتے عاجز آچکے تھے اور غالباً ہماری ہی طرح ڈسٹرکٹ بورڈ کا دفتر جہاں ان کی درخواستیں متواتر پہنچتی رہتی تھیں، ان سے نہ صرف عاجز بلکہ سخت متنفر ہو چکا تھا اور دو سال سے اس نے جواب کیا ان کے پہنچنے کی رسید تک دینا بند کردیا تھا۔ جی تو یہ چاہا کہ ان سے کہہ دیں کہ درخواست لکھنے کا نہیں اب آپ کو خود کا بجی ہو زیں بند کرادینے کا جی چاہتا ہے، لیکن پھر ان کے قریب سائیکل روک کر اور اپنے چہرے پر اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ چپکا کر بولے۔ "جب آجائیے آپ"۔

"اچھا تو پھر اب کی اتوار کو رہی۔ بڑا پریشان کر رکھا ہے اس ڈسٹرکٹ بورڈ کے بچے نے اندھیر مچا رکھا ہے اندھیر!"

"اتوار کو آئیے گا؟ اتوار کو تو شاید۔۔۔۔"

"ہاں، ہاں اتوار کو گیارہ بجے" اور یہ کہتے ہوئے عبدالقدوس جھپٹ کر پھر جگدیش بابو کے بیٹھکے میں گھس جاتے ہیں اور ہم دانت پیستے ہوئے اور یہ قسم کھاتے ہوئے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اتوار کو گیارہ بجے گھر پر نہ رہیں گے، اپنی سائیکل پر پھر سوار ہو جاتے ہیں۔

عبدالقدوس عرصہ ہوا ڈسٹرکٹ بورڈ میں محرر کا بجی ہوز تھے، چند گدھوں کو رجسٹر میں بھینس دکھا کر ان کا دانہ گھاس خود نوش فرما گئے تھے اتفاق سے پکڑ لیے گئے اور اپنے افسر اعلا کو اس کا دانہ گھاس نہ پہنچا سکنے کے باعث موقوف کردیے گئے تھے چنانچہ اب عبدالقدوس تھے اور درخواستیں اور اپیلیں اور ہم ان کے لکھنے والے۔۔۔

خیر اتوار کو! ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

ہم چڑھائی پر بڑی محنت سے سائیکل چلانے اور پھولی ہوئی سانس سے منہ ہی منہ میں بے موقع شعر گنگنانے کی بھی کوشش کر رہے ہیں ؎

چاندنی رات ہے جدائی کی
جمع ہیں آفتیں خدائی کی

کہ سامنے سے سب سے بڑی آفت یعنی ہمارے چچا میاں کسی ہاتھی کی طرح دبے پیروں آتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ یہ ہمارے چچا تو خیر رشتے کے نہیں بلکہ نام کے ہیں لیکن سارے شہر کے نہایت بے پناہ اور بے ساختہ لیڈر بہ الفاظ دیگر خدائی فوجدار ہیں، سیکڑوں تحریکوں میں حصّہ لے چکے ہیں، پچاسوں بار لاٹھی چارج کی زد میں آچکے ہیں اور بیسوں بار جیل خانے کی ہوا کھا چکے ہیں۔ متعدد بار مختلف پارٹیوں کے ٹکٹ پر مرن برت بھی رکھ چکے ہیں۔ ہمیں از راہ بندہ پروری اپنا نہایت نیازمند مرید اور خادم سمجھتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف اس قدر ہے کہ ہم بدقسمتی سے اس محلّے میں پیدا ہوئے تھے جہاں کبھی یہ بھی رونق افروز تھے اور لیڈر بننے سے پہلے محض اپنے باپ کے نالائق لڑکے تھے اور اکثر والد مرحوم کے پاس شطرنج کھیلنے آجایا کرتے۔ ہمیں دیکھتے ہی بھر پڑتے۔

"کہاں رہتے ہو جی؟"

"کچہری سے آرہا ہوں۔"

"کبھی آتے بھی نہیں میرے یہاں۔ خوب کٹے کٹے پھرتے ہو مجھ سے؟"

"چھٹی نہیں ملتی۔"

"اچھا میں مرن برت رکھنے جا رہا ہوں، آیندہ جمعرات سے! گورنمنٹ کو ایک اطلاع نامہ بھجوانا ہے اس سلسلے میں۔"

جی میں تو آیا کہہ دوں کہ مرن برت کے لیے ملک الموت کو اطلاع نامہ بھجوانا چاہیے نہ کہ گورنمنٹ کو! لیکن ہم اپنی روایتی معصومیت سے بولے۔

"لکھ جائے گا اطلاع نامہ۔"

"چہ خوش! لکھ جائے گا۔ ارے میاں کب لکھ جائے گا؟ کہیں سٹلفہ ہو گئے ہم بغیر اطلاع نامے کے تو پارٹی گور و کفن کے اخراجات دینے سے بھی انکار کر دے گی اور گورنمنٹ کے رجسٹروں میں ہماری موت مرن برت کے بجائے ہیضے سے لکھ دی جائے گی۔ میری ساری عمر کی سیاسی کارگزاریوں پر تمھاری ایک ذرا سی کاہلی سے پانی پھر کر رہ جائے گا۔

چچا میاں نے بڑے غصّے اور خشونت سے کہا۔
"تو چلیے ابھی لکھ دوں۔"
"اس وقت تو میں میونسپل بورڈ کے چیرمین کے خلاف عدم اعتماد کی ایک تحریک پاس کرانے جا رہا ہوں۔ البتہ اتوار کو آ جاؤں گا تمھارے دفتر میں۔"
"لیکن اتوار کو میرے والد کا فاتحہ ہے۔"
"خوب، خوب!" چچا میاں نے مسرّت سے جھوم کر کہا۔ "پھر کیا ہے تمھارے ساتھ پلاؤ کھا کر اپنے بھائی کو ثواب بھی پہنچاؤں گا اور میرا اطلاع نامہ بھی لکھ جائے گا ذرا ڈٹ کر!"
"لیکن میں والد کے فاتحے کے روز یتیم خانے چلا جایا کرتا ہوں اور وہیں کھانا پکوا کر یتیم بچوں کو کھلوا دیا کرتا ہوں۔"
"اس حماقت کے کیا معنی؟ دادا جی کا فاتحہ حلوائی کی دُکان پر۔"
"یتیم خانے پہنچ کر والد مرحوم کچھ زیادہ یاد آتے ہیں اور پھر دوسرے یتیم بچوں کو دیکھ کر اپنی کچھ ڈھارس بھی بندھ جاتی ہے۔"
"تو پھر والدہ مرحومہ کے فاتحے کے دن آپ کسی زچہ خانے کے مرکز پر پہنچ جاتے ہوں گے" چچا میاں نے گرج کر فرمایا اور اپنے اس بھونڈے مذاق پر ایک بھیانک قہقہہ بھی لگایا۔
دل تو چاہا کہ کہہ دیں کہ آپ کے فاتحے کے دن کسی کوڑے خانے کی زیارت کر آؤں گا، لیکن پھر خون کا گھونٹ پی کر بولا "میں سات بجے سویرے چلا جاؤں گا یتیم خانے اور چار بجے کے قریب واپس آؤں گا۔"
"ہماری شام کی چائے میں دیر ہو جائے گی، لیکن خیر تمھاری خاطر یہ بھی منظور ہے۔ ہم چار بجے آئیں گے اور چائے تمھارے ہی ساتھ پییں گے۔"
"بہت اچھا، تسلیم" ہم سائیکل پر بیٹھ کر دفعتاً روانہ ہو گئے اور چچا میاں ہماری عجلت پر کچھ مبہوت سے رہ گئے لیکن چچا میاں کے چائے پینے کی جانکاہ خبر سے ہم اپنا خون پی رہے تھے لہٰذا اسی بدحواسی میں ہم نے اپنی سائیکل غلط سمت موڑ دی۔ ہم سوچنے لگے کہ اتوار کو چار بجے پناہ کہاں لی جائے؟ فوراً ایسی ترکیب سمجھ میں آئی کہ طبیعت باغ باغ ہو گئی اور چچا میاں سے اچانک مڈبھیڑ ہو جانے کی ساری کلفت دور ہو گئی۔
...... اتوار کو سویرے ہی سے خاں صاحب کے یہاں پہنچ جائیں گے اور شروع کر دیں گے پپلو، پھر کیا ہے آدھی رات تک کے لیے چھٹی ہو جائے گی اس کے بعد نتھو، بدھو، کیا اگر خود ملک الموت بھی ہمیں ڈھونڈنے نکلیں گے تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے....
لیکن ہم نے سر اٹھا کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو ہماری روح پرواز کرنے لگی۔

غلطی سے ہم اس سڑک پر آ گئے تھے جس پر ہماری جان کے ایک چھوڑ دو دو روگ والے موجود تھے یعنی کھیم کرن بزاز اور رام اوتار پنساری۔ نہ ملتے چچا میاں اور نہ ہمیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب ہوتا۔ لعنت چچا میاں پر! کیوں نہ ان کی طرف سے گورنمنٹ کو ایسا اطلاع نامہ لکھ دیا جائے کہ اس کو پڑھتے ہی مکھیہ منتری جی ان کو کسی آرڈیننس کے ماتحت کالے پانی بھجوا دیں۔

کھیم کرن کی دکان سے تو ہم خیر آگے نکل آئے تھے لیکن رام اوتار کی دکان سامنے منہ پھاڑے کھڑی تھی، سائیکل کو واپس موڑتے تو رام اوتار سے بچ جاتے لیکن کھیم کرن سے دوبارہ بچ نکلنا مشکل ہی تھا۔ لہٰذا تن بہ تقدیر ہم نے آگے ہی بڑھنا منظور کیا۔ گردن جھکا کر سائیکل کی رفتار تیز کر دی اور وقت گزاری کے لیے دل ہی دل میں چچا میاں کو مزید لعنتیں بھیجنے لگے لیکن وہی مثل کہ چور کا دل کتنا؟ رام اوتار کی دکان کے برابر پہنچے تو کنکھیوں سے اسے دیکھنے کی کوشش کر بیٹھے اس کا ہاتھ نوشتۂ تقدیر بنا سائیکل روکنے کے لیے اٹھا ہوا تھا۔ ہم چپکے سے سائیکل سے اتر پڑے اور سراسیمگی کے عالم میں جا کر اس کے حضور میں کھڑے ہو گئے۔

ع۔ عذر میرے قتل کرنے میں آپ وہ لائیں گے کیا؟

رام اوتار اپنی چندھی آنکھوں سے بے مروتی کی چنگاریاں سی نکالتے ہوئے کہنے لگا۔ "بابو جی میں تو آپ کو بڑا بھلا آدمی سمجھ رہا تھا"

"بھلا آدمی نہ ہوتا تو اپنا سیدھا راستہ چھوڑ کر محض تم سے ملنے ادھر کیوں آجاتا؟"

"اچھا تو آپ مجھ سے ملنے آرہے تھے؟ آپ کے گھر کا سیدھا اور قریبی راستہ تو یہی ہے لیکن نہیں معلوم کیوں دو مہینوں سے آپ نے اس طرف سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے؟

"تم جانتے نہیں لالہ جی! آج کل سٹھانی روپ کلا کا ایک بڑا بیڈھب مقدمہ کر رہا ہوں چنانچہ زیادہ تر انھیں کی موٹر سے کچہری آتا جاتا ہوں۔ میں تو کئی روز سے تم سے ملنے کے لیے بے چین تھا لیکن کیا بتاؤں موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ تمہارے حساب کا مجھے خود خیال ہے۔"

"تو آج حساب کرنے آئے ہیں آپ؟ نکالو بہی کھاتہ؟"

حساب اور ادائیگی تو ہو گی اگلے اتوار کو! تم جانتے ہو کہ اتوار کے علاوہ بھلا ہمیں دم مارنے کی بھی چھٹی ملتی ہے؟ میں تو اس وقت تم سے ایک بہت خاص بات کہنے آیا تھا

"دیکھیے دو سو اڑسٹھ روپیا تو جولائی تک ہو چکا ہے اس کے بعد آپ نے اٹھارہ روپے اور چھپن روپے کا سودا اور ادھار لیا اور پھر ان روپوں کا سود۔ نہیں معلوم کب سے

تقاضا کر رہا ہوں لیکن آپ کچھ سنتے ہی نہیں۔ دو مہینوں سے ادھر کا نکلنا بھی چھوڑ دیا آپ نے میں غریب دکاندار ہوں میرا پیسا اس طرح پھنسا رہے گا تو۔۔۔۔؟"

"بھئی کہہ تو رہا ہوں کہ آیندہ اتوار کو حساب لے کر آ جانا سب صفائی ہو جائے گی، بے اعتبار سمجھتے ہو تو پھر آیندہ لین دین نہ کرنا۔ میں تو اس وقت یہ کہنے آیا تھا کہ ہیلتھ آفیسر تمھاری دکان سے گھی کا جو نمونہ لے گئے تھے اس کی جانچ ہو کر آ گئی ہے اور اس میں نوّے فیصد ملاوٹ نکلی ہے چنانچہ کئی روز سے کچہری میں تمھارے چالان کیے جانے کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔"

رام اوتار کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ہانپتے ہوئے پیٹ پکڑ کر بولا

"دُہائی بابو جی! دُہائی۔ کہیں دنیا میں اتنا بھی انیائے ہوتا ہے۔ میں تو اس ہیلتھ افسر کے بچے کو دو سو روپے دے چکا ہوں اور پھر بھی اس نے معاملہ کچہری میں پہنچوا دیا۔ اب ہوگا کیا بابو جی؟"

"ہوگا کیا ڈٹ کر پیروی کی جائے گی اور اگر کنور شمشیر جنگ کے اجلاس میں چالان آ گیا تو پھر کیا ہے! تم گھر بیٹھے رہنا میں تمھارے وارنٹ کٹنے سے پہلے ہی تمھارا چالان خارج کرا دوں گا؟"

"کتنی سزا ہوتی ہے اس جرم میں؟"

"سزا کیا؟ یہی دس سال قید بامشقت اور دس ہزار روپے جرمانہ۔"

"ارے باپ رے باپ! بابو جی اب میری لاج آپ ہی کے ہاتھ ہے آپ اپنے حساب کتاب کی کوئی فکر نہ کیجیے گا۔ پہلے میری جان اس مصیبت سے بچائیے۔ اُف۔ بڑا وشواس گھات ہوا اپنے ساتھ۔ بکر پا کر کے آپ مقدمے کا سارا حال پوچھ رکھیے گا۔ میں خبر لینے اتوار کو آ جاؤں گا آپ کے گھر پر۔"

"ہاں ہاں! اس میں کہنے کی کون سی بات ہے۔ اسی لیے تو میں خود آیا تھا تمھارے پاس۔" کہتے ہوئے ہم سائیکل سمیت رام اوتار کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن دل اس قدر مسرور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سائیکل پر گیا اڑن کھٹولے پر اڑے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر رام اوتار ہیلتھ افسر سے ملنے گیا یا کسی سے اس نے کہلوا بھیجا تو؟ آخر یہ بھانڈا ایک روز پھوٹے گا ضرور! خیر دیکھا جائے گا! اتوار تک تو اب کچھ ہوتا نہیں اور اتوار کو ہم کچھ ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور ہاں رام اوتار کے خلاف کوئی دعوا ضرور دائر ہو جانا چاہیے! لیکن بھئی واہ وا! کیا دماغ پایا ہے مابدولت نے۔ کہاں تو کمبخت آنکھیں دکھا رہا تھا اور کہاں دہائی دینے لگا ہماری۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج ۔ میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

قصہ کوتاہ طرح طرح کے حوادث سے ٹکراتے ہم افتاں و خیزاں بلکہ لرزاں و ترساں گھر پہنچے لیکن ترچھی ٹوپی اور تابناک مسکراہٹ کے ساتھ ؎

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

بیگم صاحبہ کی صورت دیکھتے ہی ہم آیندہ اتوار کے منصوبے کا اعلان شروع کر دیتے ہیں۔
"یہ کیا کسی مرثیہ خواں کی ایسی شکل بنا رکھی ہے۔ چلو اب کی اتوار کو بہت شاندار پک نک ہو گی، شاپنگ بھی کی جائے گی۔ سینما بھی دیکھا جائے گا اور پھر شام کو کسی ہوٹل میں مرغ زرّین بھی اڑایا جائے گا آج ایک ایسا معرکہ آرا مقدمہ جیتا ہے کہ بس واہ وا! سارے وکیل دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گئے۔ جج صاحب اپنی کرسی چھوڑ کر ہمارے پاس ہمیں شاباشی دینے آئے۔ ساری کچہری میں دھوم مچ گئی دھوم! ہمارے موکل کو تو شادیِ مرگ ہوتے ہوتے رہ گئی اور وہ پاگل ہو کر کمرۂ عدالت سے ایسا بھاگا ۔ ۔ ۔ ۔"

"کہ آپ کی فیس دینا بھول گیا" بیگم نے لقمہ دیا۔

"ہاں فیس تو نہیں دی اس نے لیکن آخر جائے گا کہاں کمبخت۔ ناشدنی اس کا باپ قبر سے اٹھ کر آئے گا اور ہماری فیس مع شکرانے کے ادا کرے گا۔"

"تو جب تک اس کا باپ قبر سے اٹھ نہیں پاتا تب تک کے لیے تو آئندہ اتوار کے متعلق اپنا پروگرام ملتوی ہی رکھیے۔"

"ہاں۔ نہیں۔ ہاں خیر کوئی بات نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا ارادہ ہے کہ آیندہ اتوار کو گھر پر نہ رہیں۔ تم عرصے سے اپنی خالہ کے یہاں جانے کو کہہ رہی تھیں لہذا کیوں نہ بچوں کے ساتھ اس روز تم اپنی خالہ کے یہاں چلی جاؤ اور میں کھڑے کھڑے اپنے خانصاحب سے مل آؤں بہت دنوں سے گیا بھی نہیں ہوں اُن کے گھر۔ کیا کہتے ہوں گے۔ بچارے، وہ تو اتنی شفقت سے پیش آئیں اور ہم غرور پیٹے ان کے پاس تک جانے میں اپنی کسرِ شان سمجھیں۔ یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔"

اپنی ہنسی کو مشکل سے ضبط کرتے ہوئے بیگم نے پوچھا "کون خانصاحب۔ وہی جھمّن خاں؟"

گویا بیگم کو ہمارے خانصاحب کا نام تک نہیں معلوم تھا یا ہماری دوستی دس پندرہ خاں صاحبوں سے تھی چنانچہ حسب ضرورت ہر خاں صاحب کا نام اور پتا بتانا لازمی تھا اور پھر اس موقع پر ہنسنے کے کیا معنی تھے لہذا ہم نے بُرا مان کر کہا "ہاں۔ ہاں وہی جھمّن خاں صاحب۔ جھنڈے خاں صاحب کے صاحبزادے۔"

بیگم صاحبہ اس طرح کھلکھلا پڑیں جیسے چینی کے بہت سے برتن ٹکرا کر ٹوٹ گئے ہوں

"آپ کو تو گھر یا گھاٹ کی کچھ خبر نہیں رہتی۔ جھمن خاں تو کل رات میں جوا کھیلنے کی علّت میں پکڑ لیے گئے اور اس وقت تک حوالات میں بند ہیں"

"ہائے ہائے! یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا اور مجھے خبر نہیں؟ ضمانت نہ کی کسی نے غریب کی دشمنوں کا منہ کالا! یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ آخر تمہیں یہ تازہ تازہ اطلاعیں کیسے پہنچ جاتی ہیں؟ اور خصوصاً میرے دوستوں پر آنے والی مصیبتوں کے متعلق؟"

"جھمن خاں کی بیوی نے اپنی نوکرانی بھیجی تھی آپ کے پاس۔ کہلایا تھا کہ آپ لوگوں کی صحبت میں اس درجے کو تو پہنچ گئے خاں صاحب، اب کچھ کرنا ہو تو آپ ہی لوگ کیجیےگا میں کچھ نہیں جانتی۔ چھوٹ کر آئیں گے حوالات سے تو گھر میں گھسنے بھی نہ دوں گی۔ سوالاکھ کی سرکاری عمارت دیکھ آنے کے بعد اپنے ٹوٹے جھونپڑے میں کیا سمائی ہوگی اُن کی؟"

"اُف خداوندا! کیا غضب ہوا! سویرے سے معلوم ہوتا تو اب تک نہ معلوم کب کی ضمانت ہو چکی ہوتی غریب کی! ہائے ایک سہارا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ ایک جائے عافیت تھی وہ بھی اجڑ گئی۔ ایک تفریح تھی وہ بھی اغیار کی نظر بد کی بھینٹ چڑھ گئی"۔ ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور حضرت غالبؔ کا یہ شعر بے ساختہ زباں پر آ گیا ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

سچ پوچھیے تو ہمیں جھمن خاں کی گرفتاری سے زیادہ اس بات کا افسوس تھا کہ آخر اتوار کو اب ہم جائیں گے کہاں؟ زندہ عجائب خانے؟ یتیم خانے؟ پبلک لائبریری؟ اسپتال؟ اسٹیشن کے مسافر خانے؟ لیکن ایک دو گھنٹے نہیں پہاڑ ایسا پورا دن سویرے سے شام تک بھلا ان مقامات پر کیسے گزارا جا سکتا ہے، وہاں نہ لیٹ بیٹھ سکتے ہیں نہ قہقہہ لگا سکتے ہیں: نہ گنگنا سکتے ہیں۔ اپنے دوسرے ملنے جلنے والوں یا رشتہ داروں کے یہاں جانا بالکل ہی بے سود ہوتا کیونکہ وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ سمجھدار ہیں اور وہ سنیچر کی شام ہی سے راہ فرار اختیار کر چکے ہوں گے۔ وہ تو ایک غریب خاں صاحب ہی کا دم تھا جو ایک عالی نسب ہوجنہ کی طرح ہر گرم و سرد کو اپنے اندر جذب کر لیتا اور ماتھے پر شکن تک نہ لاتا۔ اس کے قرض خواہ سحری کے لیے جگانے والوں کی طرح ٹولیاں بنا بنا کر آتے اور گھنٹوں اس کے دروازے کے سامنے رویا کرتے۔ لیکن وہ مردِ میدانِ تاش بازی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا اور ان کے شور و شغب سے اپنے کھیل کے انہماک میں بال برابر بھی فرق نہ آنے دیتا۔ اس کا گھر کیا تھا دوستوں کے لیے ایک مستقل جائے پناہ تھی ؎

ہر طرف تھا نو رِ نغمہ ہر طرف دل شاد تھا ... کیا بتائیں کتنا شہرِ آرزو آباد تھا

خاں صاحب اس جیوٹ کا ساقی تھا کہ جس کے میخانے کے دروازے کسی رند نے آج تک بند نہیں دیکھے، اور شاید یہ دروازے بند نہ رکھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ آج وہ غریب حوالات میں تھا اور اس کی بیوی نے خود اس پر اس کے گھر کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ میں خاں صاحب ہی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ بیگم نے اپنا حق زوجیت ادا کرنا شروع کر دیا۔

"میرا جمپر کتا رکھا ہے ذرا سا کپڑا کم پڑ گیا ہے آخر وہ کب لائیے گا؟"

"اتوار کو۔"

"اور نعیم کا جوتا۔"

"اتوار کو" ہم نے پھر عادتاً جواب دیا۔

"اور وہ جو گئے کو کالی کھانسی آرہی ہے اسے مویشی ڈاکٹر کو کب دکھائیے گا؟"

"اتوار کو۔"

"اور جو مر گیا نہ اس عرصے میں۔"

"اتوار کو۔"

"یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے آپ نے؟"

"اتوار کو۔"

"کیا ہو گیا ہے نصیبِ دشمناں آپ کو؟"

"اتوار کو۔"

بیگم نے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ہم اپنے عالم بے خودی میں سے عالم خودی میں آکر اپنے روزمرّہ کے معمولات میں مصروف ہو گئے۔

دوسرے روز خاں صاحب ضمانت پر رہا ہو گئے۔ ہم پروانۂ رہائی لے کر جب حوالات پہنچے تو وہ وہاں تاشوں سے شغل فرما رہے تھے، کہنے لگے "بڑے بے موقع آکر میری جیت میں مخل ہو گئے لیکن خیر اب آ گئے ہو تو ساتھ چلتا ہوں۔" راستے میں انھوں نے بتایا کہ رات ہی بھر کے کھیل میں داروغہ ان کا پانی بھرنے لگا ہے اور چونکہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے خلاف انھوں نے سرکاری گواہ بن جانا منظور کر لیا ہے، لہٰذا ان کی بریت کی بات بھی قریب قریب پکّی ہو گئی ہے۔

قبل اس کے کہ آیندہ اتوار کے پروگرام کے متعلق ہم چھیڑتے، خاں صاحب نے خود ہی یہ نادر الوجود تجویز پیش کر دی کہ آیندہ اتوار کو سویرے تین بجے کی گاڑی سے شہر کو خیرباد کہہ دیا جائے اور پانچ اسٹیشنوں کے بعد ان کی سسرال کے قصبے میں پہنچ کر ان کے ایک شاگرد کے یہاں جو بحمداللہ ایک درگاہ کے سجادہ نشیں بھی ہیں تاشوں

کی پھڑ جما دی جائے۔ صاحب سجّادہ نہ صرف سعید، مہمان نواز بلکہ تاشوں کے عاشق زاروں میں سے ہیں۔ دن بھر تاش کھیلے جائیں گے، انواع و اقسام کے کھانے کھائے جائیں گے، شام کو ڈٹ کر قوالی سنی جائے گی اور پھر رات بھیگتے ہی ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس پہنچ جائیں گے۔ خاں صاحب کی یہ تجویز کیا تھی ہمارے لیے پورا الکشن مینی فسٹو تھا۔ ہم نے اسے فوراً ہی بسر و چشم قبول اور منظور کر لیا اور صاحب سجّادہ نشین کی درگاہ کے متعلق فی البدیہہ یہ شعر پڑھ دیا ۔

یہ وہ جگہ ہے میکدہ غم کا گزر جہاں نہیں!
گردشِ جام ہے یہاں گردشِ آسماں نہیں!

سنیچر کی رات کو ہم نے بیگم صاحبہ کو یہ مژدہ جانفزا سنا دیا کہ کل سویرے تین بجے ہم ایک موکّل کا نزاعی بیان لکھانے شہر سے باہر جا رہے ہیں لہٰذا نہ صرف دو بجے اٹھ کر ہمیں ناشتہ کرا دیجیے گا، بلکہ کل دن بھر ہماری جان کے رونے والے جو حضرات ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں انھیں بھی ہماری غیر حاضری اور اس کی وجہ سے مطلع کر دیجیے گا۔ اور ہاں باہری دروازے کی دونوں کنڈیاں اندر سے بند رکھیے گا بلکہ ایک کنڈی میں کُتّا بھی باندھ دیجیے گا۔

اور پھر جب اتوار آیا ۔۔۔ ہم تین بجے سویرے ہانپتے کانپتے اسٹیشن پہنچے تو سب سے پہلا حادثہ یہ پیش آیا کہ خاں صاحب غائب تھے۔ سوچا کہ آؤ بغیر خانصاحب کے ان کے شاگرد کے یہاں پہنچ جائیں لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں دوسری گاڑی سے خاں صاحب سرکاری گواہ بنے ہوئے پولیس کی دَوِش لے کر نہ وارد ہو جائیں! کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ گاڑی آگئی۔ ٹکٹ لے ہی چکے تھے لہٰذا خود بخود گاڑی کی طرف کھنچنے لگے ۔۔۔ ہم جیسے گاڑی کا دروازہ سمجھ کر اس میں گھسنے والے ہی تھے کہ وہ دفعتاً ایک موٹے تازے مہاشے جی کا آغوش نکل آیا ۔۔۔ "خوب مل گئے بابو جی واہ وا! میں ہاپڑ سے اسی گاڑی سے لوٹا ہوں، میرے بچا رام داس جی نے جو مکان ٹھاکر بسنت سنگھ سے مول لیا تھا اور جس کو میرے پتا شیام داس جی نے پنڈت کرشن کمار کے پاس رہن دخلی رکھا تھا اور جس کو میرے بھائی گھنشیام داس نے ۔۔۔"

ہم گھر لوٹ آئے، بیگم صاحب سے اندر جا کر کہہ دیا کہ جس موکّل کا نزاعی بیان ہونے والا تھا، وہ بیان دینے سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا اور تن بہ تقدیر یہ شعر پڑھتے ہوئے لالہ ہڑبونگ داس کے پاس اپنے دفتر میں جا کر بیٹھ گئے ۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

آٹھ بجے ہوں گے اور ہم لالہ گھنشیام داس کے پسر متبنیٰ چھبیلے داس کے بہنوئی گھامڑ داس کے چچا پاپڑ داس کی داستان حیات سن رہے تھے کہ ہمارے پرانے موکل شیخ مولا بخش تشریف لے آئے اور آتے ہی چمک کر بولے : "پھر بھاگ گئی۔"

"کون ؟"

"اجی وہی ! پھر بھاگ گئی !"

"اچھا صبر کیجیے اور بیٹھیے۔"

"صبر کروں اور بیٹھوں ! خون نہ پی لوں اس حرام زادی کا۔"

"پی لیجیے۔"

"ہاں ! ہاں ! خون پیوں گا اس حرامزادی کا لیکن پہلے اس سُور کے بچے بفاتی کا سر نہ اُتار لوں گر آسے سے۔"

خدا خدا کر کے مولا بخش سنبھالے گئے اور بدقت تمام رخصت کیے گئے تو ہمارے جان لیوا مہاشے ہڑبونگ داس نے پھر اپنا چرخا چلانا شروع کر دیا ۔۔۔۔۔۔

ہم پر عالم نزع کی کیفیت طاری تھی کہ دفعتاً سڑک پر ایک غلغلہ بلند ہوا گویا ملک الموت خود تشریف لا رہے ہیں "وکیل صاحب ہیں ! وکیل صاحب !" اور پھر پنڈت نانک پرشاد اور داؤد خاں ہانپتے ہوئے ایک ساتھ نازل ہو گئے۔

"بھئی عجیب و غریب واقعہ ہو گیا ان کے یہاں" نانک پرشاد نے داؤد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنک کر کہا۔

"کیا ہوا ؟"

اب داؤد خاں نے اپنا دہانہ کھولا "میرے چچا پہاڑ خاں کل اچھے بھلے گھر آئے، کھانا کھایا، کھاتے ہی کھاتے کہنے لگے یہ مرچ کس قدر کھایا جاتا ہے تمہارے یہاں پھر ایک دم سے اٹھے پہلے تو اپنی داڑھی نوچی اور پھر میرا سارا چہرہ کھسوٹ ڈالا اور میرے منع کرنے پر مجھے مارنے دوڑے۔"

"پھر ؟"

"پھر کچھ نہیں، ڈنڈا اٹھایا اور واپس چلے گئے چُپ چاپ۔"

"تو اب آپ کیا چاہتے ہیں ؟"

"قانونی مشورہ۔"

"کس بات کے متعلق ؟"

"اب آپ جانیے ! اتنا ہی جانتے ہوتے تو اپنا وقت خراب کرنے آپ کے پاس کیوں آتے ؟"

"تو آپ اپنے چچا کی داڑھی کے متعلق مشورہ چاہتے ہیں یا اپنے چھپر کے متعلق؟"

"دونوں کے متعلق۔"

یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ عبدالقدوس ایک موٹی سی مسل پکڑے آموجود ہوئے اور پھر جل جلالہ، کیا دیکھتا ہوں کہ رام اوتار پنساری اپنا بہی کھاتہ سنبھالتا چلا آرہا ہے اور ہائے غضب اس کے پیچھے کیم کرن بزاز بھی ہے ؎

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمارے گرد دشمنوں کا حلقہ تنگ سے تنگ ہوتا جاتا لیکن ہماری پینترے بازی کی صلاحیتیں بھی درجہ بدرجہ بڑھتی ہی جاتیں اور ہم کسی نہ کسی صورت آیندہ اتوار کے سہارے اپنے حریفوں کو وقتی طور سے پیچھے ڈھکیل دینے میں کامیاب ہی ہوجاتے ؎

اس درجہ کیے زور کہ ہارے افلاک
افلاک کے جور سے نہ ہارا انسان

اب کیا بتاؤں کہ یہ اتوار کیسے گزرا اور اس کے ایک ایک لمحے میں ہم کیسے کیسے مر مر کر جیے اور جی جی کر مرے ہیں۔ ہم بار بار دعا مانگتے کہ خداوندا یا اب اس دنیا سے ہمیں اٹھا لے اور یا اس اتوار کو لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش؟ غالباً آسمان پر بھی اتوار منایا جارہا تھا، اور کوئی گھر پر موجود نہ تھا۔

خدا خدا کر کے شام پکڑی تو ذرا ڈھارس بندھی کہ اب شاید سوموار کے لیے زندہ بچ جائیں کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے چچا میاں جو صورتاً دنیز سیرتاً کسی انسان سے زیادہ کسی گینڈے سے مشابہ تھے، یتیم خانے کے بیس پچیس لڑکوں کو لیے ہوئے چلے آرہے ہیں

"یہ کیا چچا میاں؟ ابھی آپ نے مَرن برت تو رکھا نہیں؟ آپ کے جیتے جی یہ جنازے کا جلوس کیسا؟"

"تمھیں ڈھونڈتا یتیم خانے پہنچا تو مجھے خیال آیا کہ غالباً تم بھول گئے ہو اور یتیم خانے میں نہیں بلکہ گھر ہی پر کھانا پکوا کر ان یتیم بچوں کو کھلاؤ گے۔ لہٰذا ان سب کو لے کر یہاں چلا آیا۔ یتیم خانے کھانا بھجوانے میں مفت کی زحمت ہوتی نا تم کو؟ اب یہ لوگ میرے ساتھ یہیں کھالیں گے۔"

"جب یتیم خانے تک گئے تھے تو ذرا آگے بڑھ کر قبرستان بھی تشریف لے جاسکتے تھے آپ؟"

"اچھا اب دیر نہ کرو، اور ہاں تم سے خاص بات یہ کہنا تھی کہ میں نے فی الحال مَرن برت رکھنے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ تمھاری چچی کے ایک دانت میں تکلیف ہوگئی ہے

وہ رفع ہو جائے تو پھر کچھ اس سلسلے میں بھی سوچوں گا۔ ابھی فی الفور تم مجھے سیاسی پنشن کے لیے راشٹر پتی کے نام ایک مختصر سی مگر جامع درخواست لکھ دو ۔ لیکن اس میں میری تمام سیاسی کارگزاریوں کا بہت واضح ذکر آجانا چاہیے۔۔۔۔"

اس کے بعد غالباً ہم بے ہوش ہو گئے تھے کیونکہ جب ہماری آنکھ کھلی تو صحن میں سوموار کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔"

# فسادی چچا

ایک ایسے محلّے میں جو شہر کی ہماہمی سے دور ایک کونے میں تھا اور جہاں صرف چند چھوٹی موٹی دکانوں کے علاوہ نہ کوئی بازار تھا نہ سینما نہ کلب نہ کافی ہاؤس اور جہاں زیادہ تر بیوی بچوں والے کلرک مزدور اور تجارت پیشہ لوگ رہتے۔ جنھیں سویرے سے شام تک اپنی روٹی کمانے ہی سے فرصت نہ ملتی، صرف ایک فسادی چچا کا دم تھا جو اپنی لگائی بجھائی، جھوٹ فساد اور بات کے بتنگڑ بنا دینے سے آئے دن نت نئی تو تو میں میں، جھگڑے اور ہنگامے کھڑے کر کے محلّے والوں کی ٹھہرے ہوئے پانی جیسی زندگی میں کچھ بپھری ہوئی موجیں اور کبھی اچھے بھلے طوفان اٹھا دیا کرتا۔

اپنی حد سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کے باعث فسادی چچا کی شخصیت محلّے والوں کے درمیان ایک شدید اختلافی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ کچھ عاقبت اندیش انھیں شامت اعمال، وبال جان، بلکہ قربِ قیامت کی نشانی سمجھ کر ان کا وجود پورے محلّے کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتے۔ برخلاف اس کے کچھ من چلے انھیں حرکت اور زندگی کا ٹھیکیدار، ایک دلچسپ تماشا اور زندہ دلی کا سرچشمہ مانتے اور ان کی موجودگی کو محلّے کی ذہنی صحت کے لیے اسی قدر لازمی قرار دیتے جیسے جسمانی صحت کے لیے گندے نالے یا کوڑے خانے کو۔

فسادی چچا کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ لوگ ان سے اور ان کے حربوں سے ضرورت سے زیادہ واقف ہو چکے تھے لیکن وہ ہر مرتبہ اپنی چابک دستی کا جوہر دکھاتے ہوئے اپنا نیا وار کچھ اس غیر متوقع انداز اور زاویے سے کرتے کہ وہ خالی ہرگز نہ جاتا اور چوکنّے سے چوکنّے انسان پر بھی جب وہ اپنا جال ڈالتے تو وہ محض ایک صیدِ زبوں بن کر رہ جاتا۔ لوگ تلملاتے، پیختے اور چلّاتے لیکن پھر دل ہی دل میں فسادی چچا کی فنّی مہارت اور بیوقوف بنانے کی صلاحیت کی مجبوراً داد بھی دیتے سچ پوچھیے تو پورے محلّے کی اجتماعی ذہانت کے وہ تنہا جواب تھے۔

اپنی حرکات ناشایستہ سے وہ قریب قریب محلّے کے سبھی لوگوں کو کسی نہ کسی طریقے

سے گھائل کر چکے تھے اور اس کے باعث یقیناً فسادی بچا نہیں معلوم کب کے محلّے سے نکالے جا چکے ہوتے مگر ان کا خاص وصف یہ تھا کہ دوسروں کو لڑوانے کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لینے کے باوجود وہ خود کبھی کسی سے نہ لڑتے۔ اپنے متعلق دل جلوں کی کڑوی کسیلی باتیں بھی وہ مسکرا کر ہی جاتے۔ لوگ ان کے منہ پر ان کو فسادی بچا کہتے لیکن وہ بُرا نہ مانتے بلکہ اسے ایک طرح سے اپنی کارگزاریوں کا اعتراف سمجھتے۔

ایک دفعہ مولوی کبن صاحب اور ان کی دُکان کے ساجھے دار رمیش چندر لڑتے ہوتے فسادی بچا کے یہاں پہنچے اور رمیش نے غصّے اور افسوس سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا "کیوں بچا میں نے کب مولوی صاحب کو بے ایمان اور دغا باز کہا تھا" یہ آپ نے ان کے کان میں کیسے پھونک دیا؟"

بچا نے بڑے ٹھنڈے دل سے جواب دیا" اچھا مہربان! تو تم سچے اور میں جھوٹا اور میری سات پشتیں جھوٹی! اب تو خوش ہو کر مسکرا دو!"

اب کبن صاحب نے زبان بلکہ حلق کھولی۔ لیکن آپ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ یہ مجھے بے ایمان اور دغا باز کہتا ہے؟"

بچا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ لیکن اب اگر یہ آپ کے منہ پر آپ کو بے ایمان اور دغا باز نہیں کہتا ہے تو میں کیا کروں؟"

رمیش چمکا۔ اس کے کیا معنی بچا! کیا میں نے ان کی غیبت میں ان کو کبھی بے ایمان اور دغا باز کہا تھا؟"

بچا نے چمکارتے ہوئے کہا" تم نے کہا یا نہیں کہا اس کا فیصلہ تو ابھی ہو سکتا ہے لیکن میں چونکہ دونوں ہی کا خیر خواہ ہوں اور تمہارے باہمی تعلقات اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہتا لہٰذا میں سارا الزام اپنے ہی سر لینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

رمیش نے جلبلا کر کہا" بچا آپ ہم دونوں کی فکر نہ کیجیے اور نہ گھما پھرا کر بات کرنے سے کوئی فائدہ ہے۔ فیصلہ ہو سکتا ہے تو ہو جائے۔"

کبن صاحب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ہاں صاحب فیصلہ یا صفائی جو کچھ ہونا ہو ابھی ہو جانا چاہیے میرے لیے دغا بازی اور بے ایمانی کا اتہام ناقابل برداشت ہے۔"

بچا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ایک دم سے رمیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ اچھا تو تم کہہ دو کہ کبن صاحب دغا باز اور بے ایمان نہیں ہیں۔"

رمیش" میں کیوں کہہ دوں؟ بچا نے قہقہہ لگایا تو رمیش چڑھ گیا۔ "میں تو یہاں صرف اس صفائی کے لیے آیا ہوں کہ میں نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ یہ دغا باز اور بے ایمان ہیں۔"

پچا بھی تیز ہو گئے ۔ "تو کہہ نہ دو کہ یہ دغا باز اور بے ایمان نہیں ہیں ۔ بات ابھی صاف ہو جائے گی صرف ذرا سی زبان ہلا کر تم سچے بن جاؤ گے اور یں جھوٹا ۔"

رمیش ۔ "یہ الٹ پھیر کی باتیں تو میں جانتا نہیں ۔ آپ صرف یہ بتائیے کہ میں نے آپ سے کبن صاحب کا تذکرہ کب اور کیسے کیا تھا ۔"

پچا بولے ۔ "کبن صاحب کو تمہارا جو جی چاہے سمجھو لیکن وہ ایسے ناسمجھ بھی نہیں ہیں کہ وہ تمہارے اس قسم کے داؤ پیچ کو بھی نہ سمجھیں ۔"

رمیش (تعجب سے) ۔ "داؤ پیچ کیا ؟"

پچا ۔ "تم یہ کہنے کو تیار نہیں کہ وہ راست باز اور ایماندار ہیں ۔ تو تمہارا ان کے متعلق جو خیال ہے وہ صاف ظاہر ہی ہو چکا ۔ اب تم زبان سے کہو یا نہ کہو !"

کبن صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ رمیش بولا ۔ "کیا مطلب آپ کا ؟ اچھا میں کہے دیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پچا نے بات کاٹ کر ۔ "ہاں ہاں کہو کہ تمہیں دکان کے حسابات پر پورا پورا بھروسا ہے اور کبن صاحب نے اپنے بھتیجے اور خالو کے نام جو اُدھار کھاتا کھول رکھا ہے اس کو تم بالکل صحیح سمجھتے ہو ۔"

رمیش ۔ "دیکھیے اس وقت حساب اور کھاتوں کی باتیں جانے دیجیے وہ ہمارا نجی معاملہ ہے اور اس کے متعلق مجھے کبن صاحب سے یقیناً کچھ اختلاف ہے ۔"

کبن صاحب ۔ "آپ کا اختلاف آپ کی غلط فہمی ہے ۔ مجھے اگر ٹھیک سے حساب لکھنا نہیں آتا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ میں دغا باز اور بے ایمان ہوں ۔ رہے میرے بھتیجے اور خالو کے ادھار کھاتے تو وہ کوئی آپ کی چوری سے کھولے نہیں گئے اور کیا خود آپ نے اُدھار کے کئی ایک کھاتے نہیں کھلوائے تھے ؟"

رمیش ۔ "حساب ٹھیک نہیں ہے تو پھر ہر چیز مشکوک ہے اور میں نے کوئی اپنے رشتہ داروں کو تو اُدھار کھاتے کھلوا نہیں دیے ۔"

چنگاری بھڑک اٹھی تھی ۔ پچا نے ہوا دے کر اسے جلدی ہی شعلہ بنا دیا ۔ رمیش اور کبن صاحب کئی دفعہ ایک دوسرے کو دغا باز، بے ایمان اور نہیں معلوم کیا کیا کچھ کہہ چکے تو موقع محل دیکھ کر پچا نے ایک نیا پلٹا کھایا، مسکراتے ہوئے کبن صاحب سے بولے "ہاں صاحب میں نے کب آپ سے کہا تھا کہ رمیش آپ کو دغا باز اور بے ایمان کہتا ہے ۔" کبن صاحب نے اس غل غش میں اس غیر متوقع سوال کا تفصیلی جواب دینا غیر ضروری سمجھا ۔ " اجی وہ تو میرے منہ پر مجھے دغا باز اور بے ایمان کہہ رہا ہے ! اور میں ابھی اس کی دغا بازی اور بے ایمانی کھول کر رکھ دوں تو آپ عش عش کر جائیں ۔"

اور پھر جب رمیش اور کپتن صاحب کے درمیان زبانی تو تو میں میں کے بعد آستینیں چڑھنے لگیں تو انتہائی شفقت بزرگانہ سے فسادی چچا درمیان میں آگئے اور بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا، معاملہ نہیں سلجھتا ہے تو آخر سرکاری عدالتیں کس مرض کی دوا ہیں!
دوسرے دن کپتن صاحب اور رمیش کی دکان کا بٹوارا ہو گیا اور دونوں ہی نے چند دنوں کے بعد ایک دوسرے پر مختلف اقسام کے دعوے کر دیے۔ فسادی چچا کا نام دونوں ہی کی فہرست گواہان میں جلی حرفوں میں سب سے اوپر درج تھا۔
فسادی چچا کے محلے میں بلکہ ان کے مکان کے بہت قریب مجھے کرایے پر ایک کمرہ ملا تو کئی دوستوں، واقف کاروں اور خدائی فوجداروں نے سمجھایا کہ اگر مجھے اپنی عزت آبرو پیاری ہے اور بیچ بازار میں اپنی ٹوپی اچھلوانا منظور نہیں ہے تو فسادی چچا کا ہمسایہ بننے کے خیال فاسد سے باز آؤں۔ کسی نے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا کہ وہ پرلے درجے کے جھوٹے اور فسادی ہیں اور دوستوں اور عزیزوں کے درمیان جوتا چلوانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ کسی نے باقاعدہ اعداد و شمار پیش کیے کہ انھوں نے اتنی لگی ہوئی شادیاں چھڑوا دیں، اتنی فوجداریاں کروا دیں اور اتنے جھوٹے مقدمات چلوا دیے۔ کسی نے ان کا یہ کارنامہ بیان کیا کہ انھوں نے ایک آئی ہوئی برات کافی مرمت کے بعد واپس کرادی تھی۔ کسی نے اس کے جوڑ کا یہ جوابی حملہ بیان کیا کہ انھوں نے ایک صاحب کے یہاں بن بلائی برات بھجوا دی تھی۔ کسی نے ان کے متعلق یہ داستان سنائی کہ انھوں نے ایک ہی محترمہ پر بیک وقت ایک باپ اور بیٹے دونوں کو عاشق کرا دیا اور کسی نے ان کے خلاف یہ واقعہ بیان کیا کہ انھوں نے ایک مرنے والے کا جنازہ اٹھنے سے پیشتر ایک وارث کو جیل اور دوسرے کو اسپتال بھجوا دیا تھا ایک صاحب نے ان کا یہ لطیفہ بیان کیا کہ ایک جلسے میں انھوں نے ایک خود ساختہ خطبۂ صدارت چھپوا کر تقسیم کروا دیا تھا جس کی وجہ سے اصلی صدر کو اپنا خطبہ لے کر اور جوتے چھوڑ کر جلسے سے بھاگنا اور کئی دنوں تک روپوش رہنا پڑا وغیرہ وغیرہ۔
فسادی چچا کے متعلق یہ باتیں اور اس قسم کی دوسری بہت سی باتیں سن کر میں ان سے دور بھاگنے کے بجائے ان سے ملنے کے لیے اور بھی بے چین ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے خیال میں انتہائی عقلمندی اور اپنے کان بھرنے والوں کے خیال میں انتہائی بیوقوفی سے یہ جواب دیا، "بھئی جب کوئی شخص اتنا نمبری اور مشہور جھوٹا، فسادی اور فتنہ پرداز واقع ہوا ہے تو اس کے جھانسے میں آ جانا ویسا ہی ہے جیسے کسی بجلی کے ایسے کھمبے سے ٹکرا جانا جس پر 'خطرہ ہے' کا سائن بورڈ دور سے چمک رہا ہو!"
مجھے اپنے کمرے میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا کہ اچانک سامنے دروازے کا

پردہ ہٹا اور ایک پستہ قد، وجیہہ گورے چٹے اور سفید داڑھی والے بزرگ اندر جھانکتے ہوئے نظر آئے۔ صورت شکل، وضع قطع سے وہ ایسے معلوم ہوتے کہ ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ انھوں نے فرمایا السلام علیکم! کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

میں فوراً پہچان گیا کہ وہ فسادی چچا ہیں۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے عرض کیا: "وعلیکم السلام! آئیے آئیے ضرور تشریف لائیے" اور لپک کر ان سے مصافحہ کرتے ہوئے انھیں کمرے کی سب سے آرام دہ کرسی پر بٹھا دیا۔ اس وقت وہ خلوص اور محبت کا ایک حسین مرقع دکھائی پڑتے۔

بڑی شفقت سے میرا نام، پتا اور خاندانی حالات پوچھتے رہے اور اس کے بعد کچھ بے تکلفی سے بولے "کیوں میاں آپ کو اپنا کمرہ پسند آیا؟"

میں نے عرض کیا "جی ہاں کمرہ تو غنیمت ہے لیکن غالباً یہ جنت کے کسی انجینیر کے مشورے سے تعمیر کیا گیا ہے کیونکہ جنت ہی کی طرح اس سے متعلق کسی باورچی خانے، پاخانے، غسل خانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے"۔ میرے اس جملے سے بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے "ہاں، نہ یہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا بیٹا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ کسی مکان سے متعلق ہے اور نہ کوئی دوسرا جزو اس سے متعلق! اچھا تو پھر کام کیسے چلتا ہے۔ میرے لائق جو خدمت ہو میں اس کے لیے بسر و چشم حاضر ہوں"۔

میں نے کہا "کھانا ہوٹل میں کھاتا ہوں۔ اس کا خمیازہ محلّے کے سب سے بڑے جمہوری ادارے یعنی بم پولیس میں بھگتتا ہوں۔ غسل خانے کی یاد تازہ کرنے کے لیے سامنے سڑک پر نل لگا ہوا ہے لیکن ابھی تک میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا ہے کہ سڑک پر بیٹھ کر اپنے جسم کی نمایش کروں۔ لہٰذا بصورت موجودہ صرف غسل خانے کی تکلیف ہے"۔

فسادی چچا پہلے کچھ ہنسے پھر سنجیدگی سے کہنے لگے "میاں یہ تکلیف تو چٹکی بجاتے دور ہو سکتی ہے۔ دیکھیے آپ کے کمرے سے بالکل ملا ہوا دکھن جانب جو سرخ مکان ہے اس میں مرزا بہادر بیگ رہتے ہیں۔ اکیلے آدمی ہیں لہٰذا ان کے لیے مکان کا صرف اوپری حصّہ کافی ہے اور اس کو بند کر کے وہ سویرے کام پر چلے جاتے ہیں... نیچے کا حصّہ جس میں غسل خانہ اور فلش ہے وہ محلّے والوں ہی کے لیے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ آس پاس کے لوگوں میں جس کا جی چاہتا ہے اسے استعمال کرتا ہے بلکہ آپ سے پہلے اس کمرے میں جو طالب علم رہتا وہ بھی نہانے دھونے کے لیے وہیں جاتا۔ آپ بے تکلف وہاں چلے جایئے گا اور احتیاطاً آج یا کل ہی میں آپ کا مرزا صاحب سے تعارف بھی کرا دوں گا"۔

میں نے مزید احتیاط کے لیے پوچھا "تو مجھے برو ٹھے میں جا کر کسی کو پکارنا ہوگا؟" بولے "پکاریے گا کس کو؟ دن میں وہاں رہتا ہی کون ہے۔ البتہ خدانخواستہ رات میں

کوئی ضرورت پیش آجائے تو مرزا صاحب کو پکار لیجیے گا۔"

اس کے بعد فسادی چچا دنیا کی بے ثباتی، موجودہ زمانے کے اخلاق کی پستی اور دوستوں کی توتا چشمی کا تذکرہ کرتے رہے اور کافی دیر کے بعد جب وہ جانے کے لیے اُٹھے تو مجھے ایک حد تک یقین ہو چکا تھا کہ وہ ایک شریف اور بامروّت انسان ہیں اور محض غلط فہمی کی بنا پر انھیں فسادی چچا کا لقب دے کر مطعون اور بدنام کر دیا گیا ہے۔ وہ ظالم نہیں بلکہ مظلوم نظر آتے ہیں۔

دوسرے روز نو بجے سویرے جب ایک پرلطف غسل صحت کی امید میں گنگناتا ہوا اپنے کمرے کے دکھن جانب سرخ مکان میں بردھاڑے کر کے اندر داخل ہوا تو۔۔۔ فضا میں دو یا شاید تین وحشت زدہ نسوانی چیخیں گونجیں اور پھر میں نے اپنے آپ کو بھاگتا اور اپنے تعاقب میں ایک لٹھ باز قسم کے انسان کو جو بہادر بیگ ہی معلوم ہوتے دوڑتا پایا۔ بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ بند کر لیا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے شور و غل سے آدھے محلے کو جمع کر کے بہادر بیگ نے میری شان میں جو فی البدیہہ اور بے ساختہ قصیدہ پڑھا وہ یقیناً اپنی نوعیت سے فردوسی کے شاہنامے قسم کی کوئی چیز تھی۔ آخر جب ضبط کا یارا نہ رہا تو میں نے سلاخوں والی کھڑکی کا پٹ کھول کر عرض کیا "آپ کے اس قصیدے کا ثواب یقیناً فسادی چچا کی روح پُرفتوح کو پہنچے گا۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔" اور میں نے فسادی چچا کی دعوت غسل کا پورا قصہ سنا دیا۔ چچا کا نام آتے ہی پورا مجمع قہقہہ لگانے لگا حتیٰ کہ خود بہادر بیگ سے بھی ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور خدا خدا کر کے بات آئی گئی ہو گئی۔ واقعی چچا نے پانی کی بجائے میرے خود اپنے خون سے نہانے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے خفت اور شرمندگی سے زیادہ اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ میں چچا کے ایسے صاف اور کھلے ہوئے چکر میں کیسے آ گیا؟

دوسرے روز چچا ملے پہلے تو خوب دل کھول کر ہنسے پھر معذرت خواہ لہجے میں بولے "تمھارے سر کی قسم مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ بہادر بیگ کا بچہ اپنے وطن سے ایک چھوڑ دو دو بیویاں لے آیا ہے۔ خیر تم چاہو تو غسل کے لیے میرے گھر آ سکتے ہو۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر اس دوسری دعوت کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر کر دی۔

اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد بھی فسادی چچا ہفتے میں ایک یا دو دفعہ میرے کمرے میں آئے لیکن میں نے ایک سرے سے قسم کھا رکھی تھی کہ میں نہ تو ان کی کسی بات کو صحیح سمجھوں گا اور نہ ان کے کسی مشورے پر عمل کروں گا اور سچ پوچھیے تو وہ خود بھی اب صرف رسمی باتیں کرتے اور مجھے کوئی مشورہ نہ دیتے۔

ایک روز وہ مجھے راستے میں مل گئے۔ پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ

ناصر صاحب کی دکان سے ڈبل روٹی اور مکھن لینے جا رہا ہوں۔ کہنے لگے "خوب یاد آگیا۔ عبدالقدوس ملے تھے اور ناصر صاحب کو بہت بہت سلام کہا ہے اور خیریت پوچھی ہے۔ تم جا رہے ہو تو کہہ دینا۔" میں کیا جانتا کہ اس سیدھی سادی سی بات میں بھی فتنہ و فساد کا کوئی پٹاخا ہو سکتا ہے۔ میں ناصر صاحب سے ابھی ٹھیک سے، چچا کی پوری بات بھی نہ کہہ پایا تھا کہ وہ جلدے سے باہر ہو گئے اور لگے اول فول بکنے اور پھر ایک دفعہ بندر کی طرح خوخیا کر وہ دوڑ ہی تو پڑے مجھ پر — یہ دوسرا موقع تھا جب مجھے بھاگ کر اپنے کمرے میں روپوش ہونا پڑا۔

بعد میں محلے والوں سے تحقیقات کرنے پر پتا چلا کہ عبدالقدوس نے نہ صرف ناصر صاحب کی بہن سے ان کی مرضی کے خلاف شادی کر لی تھی بلکہ ایک دفعہ سرِ بازار ان کی مرمّت بھی کر دی تھی، لہٰذا اب ناصر صاحب کے سامنے عبدالقدوس کا نام لینا ویسا ہی تھا جیسے مرکھنے بیل کو سُرخ رومال دکھانا۔ کئی روز بعد فسادی چچا ملے تو میں نے خود ہی پکار کر کہا۔ "چچا یہ دوسری باؤنڈری تھی۔" قہقہہ لگاتے ہوئے بولے "تمہارے سر کی قسم میں کیا جانتا تھا کہ یہ ناصر اتنا پاگل ہے۔"

اس واقعہ کے بعد بھی چچا میرے یہاں آتے رہے لیکن مجھے پہلے سے بھی زیادہ محتاط دیکھ کر خود بھی اپنی باتوں میں بڑی احتیاط برتنے لگے۔ اس کے باوجود ہم دونوں کے درمیان ایک خاص قسم کا خلوص اور اپنائیت تھی مگر اس کو نہ میں ظاہر کرتا اور نہ وہ۔

ایک روز جب کہ میں دفتر جا رہا تھا مجھے راستے میں ملے اور بڑے رقت آمیز لہجے میں بولے "میاں آج میری کمر ٹوٹ گئی میرا بچپن کا دوست اور ساتھی رام ناتھ چل بسا بچارا پندرہ دن سے فالج میں مبتلا تھا۔ ہاتھ پیر کیا زبان تک ہلانے سے مجبور تھا۔ خیر اس کی تو مٹی سوارت ہو گئی لیکن میرا لطفِ زندگی ختم ہو گیا۔ عجب باغ و بہار طبیعت پائی تھی اس نے!"

میں نے اظہار ہمدردی میں کچھ جملے کہے تو فرمایا۔ "آؤ کھڑے کھڑے تم بھی نہ ہو لو اس کے گھر! محلّے کا معاملہ ہے ایک دوسرے کے غم میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔"

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کروں؟ سامنے ہی رام ناتھ جی کا مکان تھا۔ فسادی چچا کے ساتھ میں بھی اندر چلا گیا لیکن دل میں اس یقین کے ساتھ کہ رام ناتھ جی مرے ہرگز نہ ہوں گے۔ مگر وہاں پہنچ کر فسادی چچا کا قول صحیح پایا، رام ناتھ جی واقعی مر گئے تھے اور ان کی لاش کو شمشان بھوم لے جانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ چچا ارتھی کے سرہانے کھڑے زار قطار رو رہے تھے کچھ دیر بعد سسکیاں لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے "اچھا تم جاؤ دفتر کی دیر ہو رہی ہو گی البتہ راستے میں چورا ہے

پر ڈکشٹ جی کی دکان پر اور آگے بڑھ کر نانک چند وکیل کو ضرور اطلاع کرتے جاناکہ رام ناتھ آج سویرے گزر گئے اور ارتھی بس اٹھنے ہی جا رہی ہے۔"
میں نے پچا کی ہدایت کے بموجب ڈکشٹ جی اور نانک چند وکیل کو اطلاع دے دی۔ جب ان دونوں نے پوچھا کہ آخر مرحوم بیمار کیا تھے؟ تو انتہائی سادہ لوحی سے کہہ دیا کہ "پندرہ دن سے فالج میں مبتلا تھے۔"
شام کو میں دفتر سے آیا تو کچھ دیر بعد ایک صاحب تشریف لائے اور پوچھا "کیوں صاحب رام ناتھ جی کیا فالج سے مرے تھے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "جی ہاں۔" کچھ دیر کے بعد میں جو نکلا تو وہ صاحب جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے بزرگ نمودار ہوئے "آپ کو معلوم ہے کہ رام ناتھ کا کس مرض میں دیہانت ہوا" میں نے انتہائی سادہ لوحی سے عرض کیا "جی نہیں" اور یہ جواب سنتے ہی وہ بزرگ بھی تیزی سے روانہ ہو گئے میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے اور رام ناتھ کی موت کا سبب مجھ سے کیوں پوچھا جا رہا ہے؟
دوسرے روز دس بارہ آدمیوں کا ایک غول انتہائی بے تکلفی سے میرے چھوٹے سے کمرے میں گھس آیا۔ ایک گول مٹول شخص نے کڑک کر مجھ سے پوچھا "آپ کو معلوم ہے رام ناتھ کس مرض میں مرے؟" میں نے گربہ مسکین بنتے ہوئے کہا "جی نہیں"! اور فوراً غول کے ایک گروہ سے آوازیں بلند ہوئیں "جھوٹا، مکار، توڑ لیا گیا ہے کم بخت" دوسرے گروہ نے فوراً لقمہ دیا "سچ کہہ رہا ہے! بہتان تراشا گیا تھا اس پر۔"
پہلے گروہ کے بڑی بڑی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے مورمانے آستینیں چڑھاتے ہوئے آگے بڑھ کر پوچھا "آپ نے ڈکشٹ جی اور نانک چند سے یہ نہیں کہا تھا کہ رام ناتھ فالج میں مرے ہیں؟" میں نے پسینا پوچھتے اور ہکلاتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں کہا تھا؟" اور پھر دونوں گروہوں میں متضاد اور کچھ ناگفتہ بہ آوازوں کا ایک شور و غوغا اٹھا۔
"دیکھا آپ نے گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ اس بے ایمان کا کیا اعتبار؟"
"سچ کبھی چھپتا نہیں۔ جعلی وصیت نامے پر شاید اس کے بھی دستخط ہیں" "وصیت نامہ جعلی کیسے ہو سکتا ہے؟" "جعلی نہیں تو کیا اصلی ہے؟" وغیرہ وغیرہ اور پھر کسی صاحب نے کسی صاحب کے ایک چپت جمادی جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا یعنی اس کے بعد ایک گروہ دوسرے گروہ پر پل پڑا اور باقاعدہ مار پیٹ شروع ہو گئی۔ میری میز کرسیاں، کتابیں، جوتے، گلاس، صراحی، لیمپ وغیرہ اسلحات جنگ کا کام دے رہے تھے۔
اس سے قبل دو موقعوں پر میں نے سڑک سے بھاگ کر اپنے کمرے میں پناہ لی تھی لیکن

اس موقع پر اپنے کمرے سے بھاگ کر مجھے سڑک پر پناہ لینی پڑی!

میرے اوپر فسادی چچا کا یہ تیسرا اور آخری حملہ تھا کیونکہ اپنے کمرے میں میدان جنگ بنائے جانے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد اپنے سامان کے باقیات صالحات کو لے کر میں ایسا بھاگا کہ محلّے والے اب تک میرا پتا پوچھتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے کمرے میں جو دو گروہ لڑے تھے وہ رام ناتھ کے وارثان اور متعلقین تھے اور ان کے درمیان مرحوم کا ایک وصیّت نامہ بنائے تخاصمت تھا اور اس کے اصلی اور جعلی ہونے کا دارومدار مرحوم کا مرض الموت تھا۔

چند ماہ ہوئے، بچارے فسادی چچا بھی اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن مرحوم نے مرنے کے بعد جو شگوفہ چھوڑا وہ یقیناً ان کا شاہ کار تھا۔

محلّے میں سلیمن بوا اپنی زبان درازی کے لیے مشہور تھیں وہ اکثر فسادی چچا کو گالیاں اور کوسنے دیا کرتیں جو وہ ہنس کر ہی جایا کرتے۔ البتہ انھوں نے مذاقاً یہ ہوائی اُڑا رکھی تھی کہ سلیمن بوا کے سب سے بڑے لڑکے کے باپ وہ خود ہیں۔ سلیمن بوا اشارتاً اور کنایتاً بھی اس کی بھنک پاتیں تو فسادی چچا کی سات پشتوں تک کے پیاز کے جیسے چھلکے اتار کر رکھ دیتیں مگر فسادی چچا پر کچھ اثر نہ ہوتا اور وہ قہقہے ہی لگاتے رہتے۔ فسادی چچا مرے تو پتا چلا کہ وہ اپنے مکان، دکان بلکہ جملہ جائیداد کا وارث سلیمن بوا کے بڑے لڑکے کو اپنا لڑکا بتا کر کر گئے ہیں۔ سلیمن بوا جو پہلے اپنے بوسیدہ کچّے مکان میں نہایت عسرت کی زندگی بسر کرتیں اب فسادی چچا کے طفیل میں ان کے کشادہ مکان میں اپنے بچّوں کے ساتھ انتہائی فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہی ہیں البتہ اب بھی جب فسادی چچا کا نام آجاتا ہے تو وہ انھیں ہزاروں صلواتیں سناتی ہیں اور جہنمی کے لقب سے یاد کرتی ہیں، یقیناً اگر جہنمی زندہ ہوتے تو اپنے اس آخری مذاق سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

# عِشق کی کونین

ء نکل تو موئی:۔ ذرا نہ ہوتا تو میں بیچ بیچ نازو کو موٹر سے دھکیل ہی دیتی۔
موئی کا دیدہ! ماموں صاحب موٹر پر ہم لوگوں کو چھوڑ کر سامنے والی دکان پر کچھ خریدنے چلے گئے اور ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحبزادے لگے ہماری موٹر کا طواف کرنے اور ہم لوگوں کو گھورنے! میری تو جان ہی نکل رہی تھی اور مارے ڈر کے آنکھ نہ اٹھتی اور نازو کی ڈھٹائی کہ منہ پھیر پھیر کر انھیں چونچ دکھانے لگی۔ یہاں تو دل قابو میں نہیں، غیرت سے پسینے پسینے اور وہ کم بخت مارے ہنسی کے بے تاب۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا، اور لگی میں دانت پیس پیس کر اس کے چٹکیاں لینے۔ ماموں صاحب آگئے ورنہ میں اسے موٹر سے باہر دھکیلے بغیر نہ رہتی۔

تین چار روز بعد شام کو ہم لوگ بیڈمنٹن کھیل رہے تھے، کھیلتے کھیلتے نازو میرے قریب آئی اور رازدارانہ انداز سے کہنے لگی "وہ دیکھیے، آپ کے پیچھے آپ کے وہ مرے جا رہے ہیں!" میں گھبرا کر پیچھے گھومی تو واقعی وہی صاحبزادے کوٹھی کے باہر کسی پیڑ کی طرح نصب تھے اور ہم لوگوں کو اس انہماک سے گھور رہے تھے گویا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جانا چاہتے ہوں۔ مجھے اس وقت کچھ نہ سوجھا، میں اپنا ریکٹ پھینک کر فوراً اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد نازو بھی ہنستی ہوئی داخل ہوئی۔ اس کے "آپ کے وہ" پر میں نے اس کی خوب ہی ضیافت کی، یعنی اسے خوب ٹھونکا، لیکن وہ ایک بے غیرت واقع ہوئی تھی۔ مار کھاتی جاتی توبہ کرتی جاتی اور پھر فقرے بھی کستی جاتی۔

اب مجھے ایک کھٹکا سا لگ گیا تھا اور کوٹھی سے باہر نکلتے شرم آتی کہ کہیں نہ کہیں سے وہ بدمعاش ضرور گھور رہا ہوگا مجھ کو! ساتھ ہی مجھے نازو پر کبھی غصہ اور کبھی ہنسی آتی کہ نہ اس روز موٹر میں اپنی چہلیں شروع کرتی اور نہ یہ بلائے بے درماں پیچھے لگتی۔

دو ہی روز بعد جب شام کو میں اپنے کمرے میں آئی تو میں نے دیکھا کہ روشندان

کے سامنے بہت سے پھول پڑے ہیں جیسے کسی نے باہر سے پھینکے ہوں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں بڑی دیر تک صوفے پر بے حس و حرکت، پسینے پسینے بیٹھی رہی۔ "یا میرے اللہ اب کیا کروں؟"

میں نے جلدی سے پھول چن کر گلدان میں رکھ دیے اور اپنی کتابیں لے کر نازو کے کمرے میں پڑھنے چلی گئی۔ نازو سے میں نے کچھ نہیں بتایا ورنہ وہ اور کٹے پر نمک چھڑکتی لیکن مجھے گم سم دیکھ کر وہ بار بار پوچھتی کہ آج میں نے کیوں قسم کھائی ہے کہ الجبرے کا جو بھی سوال لگاؤں غلط ہی لگاؤں اور میں مارے خوف کے لرزہ برا ندام تھی کہ یا اللہ اب کیا ہوگا؟ کیا واقعی عشق یوں ہی شروع کیا جاتا ہے اور کیا مجھے اپنی مرضی کے خلاف مجبوراً لیلیٰ یا شیریں بننا ہی پڑے گا؟

چار روز تک تو خالی گل فشانی ہوتی رہی لیکن پانچویں روز پھولوں کے ساتھ نوک خار میں ایک پرچہ بھی لگا ہوا تھا جس پر صرف یہ شعر تحریر تھا۔

میں تڑپتا ہوں تم آؤ کہ اجل کو بھیجو!
چاہیے کچھ تو مرے درد کا درماں ہونا!

میں غصے سے بد حواس ہو گئی اور جی میں آیا کہ ابھی ماموں صاحب کے پاس جا کر سارا قصہ بیان کر دوں، اور بدمعاش کو خوب جوتے لگواؤں، لیکن پھر اپنی فطری شرم و حیا سے خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ میں نے سوچا کہ یہ سب نازو ہی کے پاپڑ بیلے ہوئے ہیں، نہ وہ اس روز چوبیخ دکھاتی اور نہ یہ بدمعاش ستو باندھ کر میرے پیچھے پڑتا۔ اور پھر میں نے بھی تو ابھی تک اس سے کوئی اظہار ناراضگی نہیں کیا ہے۔ وہ کم بخت کیا سمجھتا ہوگا؟ مجھے بڑی غیرت آئی کہ چار روز تک وہ پھول پھینکتا رہا اور میں کچھ نہ بولی۔ میں نے فوراً ہی پرچے کی پشت پر "دو جوتے" لکھ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ رات کو بڑی دیر تک مجھے نیند نہ آئی اور کئی دفعہ سوتے سوتے گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ سویرا ہوتے ہی میں دوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچی کہ جا کر وہ پرچہ اٹھا لاؤں کہ کہیں وہ کسی اور کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے۔ لیکن اس کا پتا نہ تھا۔ جیسے موا بدمعاش میرے جواب ہی کا منتظر ہو؟

دن بھر میں ڈرا کی۔ شام ہوتے ہی میں نے نازو کو بھی اپنے کمرے میں گھسیٹ لیا اور ہم لوگوں کے سامنے روشندان سے گل فشانی شروع ہوئی۔ میں نے نازو سے کہا، "دیکھ اپنے گن" "اب بتا میں کیا کروں؟"

نازو بجائے اس کے کہ کچھ گھبراتی، کھکھلاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ "اخاہ" "یہ بات ہے، اب تو ہیں یہ آپ کے وہ؟" ذرا نہ ہوتا تو میں رونے لگتی۔

سب سے آخر میں ایک پھول سے ایک پرچہ الجھا ہوا تھا جس پر صرف ایک لفظ

تھا " ناپ " میں رونے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن میں ہنس پڑی۔ میں نے نازو کو گل فشانی کا سارا قصہ سنایا اور پھر اپنے " دو جوتوں " کا یہ جواب " ناپ " دکھایا
" ہونے لگیں نہ فرمائشیں " ؛ نازو نے مٹک کر کہا۔
میں نے لپک کر نازو کی پیٹھ پر زور سے ایک دو ہتڑ مارا " نازو تمہارے سر پر قضا کھیل رہی ہے، جاتی ہوں ابھی ماموں صاحب سے تمہاری ساری کارستانی کہہ دوں گی " میں واقعی بڑے غصے میں تھی اور جی میں آیا کہ ابھی اور اس نازو کی بچی کی جان ایک کر دوں۔
اب نازو کو دیکھیے کہ کم بخت کو سانپ ہی تو سونگھ گیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دفعتاً اٹھی اور ایک پرچہ کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔
" ارے یہ کیا ؟ " میں زور سے چلائی۔ نازو نے مٹک کر کہا " تمہارے جوتے کی ناپ تین چار ! "
" ارے " کہہ کر میں اس پر لپکی لیکن وہ قہقہہ لگاتی کمرے سے غائب ہوگئی۔ میں صوفے پر گر گئی۔ اب میں تھی اور پریشانی۔ اور ڈراونی رات !
اپنی پریشانی کا حال کیا بتاؤں ؟ پہاڑ سے دن کاٹے نہ کٹتے کھڑکی سے باہر بھر نکالتے ڈر لگتا۔ اسکول میں چھٹیاں تھیں لہذا دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ نازو کئی دفعہ میرے کمرے میں آئی لیکن میں منہ پھلائے بیٹھی رہی اور اسے ڈپٹ کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ تین روز تک پھول نہیں برسے چوتھے روز پھر سلسلہ جاری ہوا۔ آخری پھول سے پھر ایک پرچہ نتھی تھا " جوتے پھاٹک کے پاس والی جھاڑی میں ہیں، فوراً نکال لیجیے خط بھی ہے "
ذرا نہ ہوتا تو میں چکرا کر گر پڑتی۔ اب اگر جوتے لاتی تو مشکل اور نہ لاتی تو مشکل میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں جوتے اور خط کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائیں جو ناک ہی کٹ جائے۔ ناچار کیا کرتی نازو کو جا کر پکڑ لائی اور اسے خوب مارا اور دھمکایا لیکن وہ بے غیرت ہنستی اور مذاق ہی کرتی رہی اور بالآخر جب اسے جوتوں کی آمد کی خبر ملی تو جھاڑی سے فوراً جوتے نکال لائی۔ جوتے تو خود پہن لیے اور خط لا کر بڑی تعظیم سے مجھے پیش کیا۔ خط کیا تھا " میری جان " " شبِ فرقت " " غمِ جدائی " " ہائے دل " کا معجون مرکب تھا۔
میں تو خاک نہ سمجھی کہ اس میں کیا لکھا ہے لیکن جتنی دیر میں پڑھتی رہی، نازو بہت معنی خیز طور سے اپنا سر ہلاتی رہی۔ جیسے وہ کوئی بہت اہم دستاویز ہو۔ اپنی ہنسی بمشکل ضبط کر کے کہنے لگی " پیاری شاہدہ۔

ع میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو۔

تمہارا معاملہ اب بہت بڑھ گیا ہے۔ تم میری طرف گھورو نہیں، خفا نہ ہو تمہاری وجہ سے نہیں تمہاری بے وقوفی سے۔"

میں نے دانت پیسے اور گھونسا دکھایا لیکن بے سود!

"اب بات یہ ہے کہ اگر یہ بات بڑھی تو پھر بدنامی اور خودکشی کا ڈر ہے، میری بات مانو تو یہ بات ابھی دب سکتی ہے۔"

"کیسے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"دیکھو تم نے پڑھا ہے کہ اکثر روپے نے محبت کو شکست دی ہے، پھر تم بھی یہی کرو۔" اس نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا جیسے کوئی جج اپنا فیصلہ سُنا رہا ہو۔

مجھے نہ معلوم اس وقت کیوں اس سے بڑی محبت معلوم ہوئی۔ میں اسے اپنے صوفے پر گھسیٹ لائی۔ بتا کمینی میں کیسے شکست دوں۔ محبت کو نہیں بدمعاشی کو؟"

"بدمعاش کی جیب خالی کر کے" نازو اکڑ کر بولی۔

"یعنی میں اس کے گھر جا کر ڈاکہ ڈالوں" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ نازو نے منہ بگاڑ کر کہا" آپ مارے فرمایشات کے اپنے عاشق صاحب کی عقل ٹھیک کر دیجیے پھر دیکھیے کہ دو ہی دن میں اس کا بخار ایسا ہوا ہوتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"مجھ سے تو یہ نہ ہو گا۔ اگر یہ بات کسی اور کے کان میں پڑی تو پھر عزت اور آبرو سب خاک میں مل جائے گی اور ماموں صاحب مارے جوتوں کے چاندا گنج پلپلی کر دیں گے۔"

"اگر اس کا ڈر ہے۔ بی بی بنو تو پھر تمہاری تصویر اخبارات میں چھپے گی۔ ہزاروں آدمی تمہیں دیکھنے ہر وقت مکان کے سامنے موجود رہیں گے اور تمہارے عاشق صاحب کا بڑی دھوم دھام سے جنازہ اٹھے گا۔" نازو یہیں تک کہنے پائی تھی کہ میں نے اس کا منہ دبا کر اسے بڑی زور سے دھکیل دیا۔

قصہ مختصر ایک گھنٹہ تک مجھ سے اور نازو سے بڑی تو تو میں میں ہوتی رہی اور بالآخر یہ طے پایا کہ نازو میرے عاشق صاحب کو مجھ سے بلا شرکت غیرے لے لے بلکہ ہم لوگ اپنے کمرے بھی بدل لیں اور اس کے بعد اسے پورا اختیار ہو گا کہ جس صورت سے چاہے وہ ان کی حجامت بنائے۔ اور اس آفت سے مجھے چھٹکارا دلانے کے صلے میں میں ہمیشہ اس کی شکرگزار رہوں گی۔

دوسرے روز ابھی گل فشانی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نازو کہنے لگی "میرا تو جی

چاہتا ہے ابھی ابھی گرم گرم رس گلے منگاؤں اس بدمعاش سے "۔
" ناک کٹا دے گی تو کم بخت " میں نے دانت پیس کر کہا۔
خیر نازو مان گئی اور بجائے گرم گرم رس گلوں کے اس نے گراموفون ریکارڈوں کی فہرست میں چند ریکارڈ پر نشان لگا کر کاغذ باہر پھینک دیا۔
عاشق صاحب قریب ایک ہفتے غائب رہے اس کے بعد پھولوں کے ذریعے اُن کا خط آیا کہ بوجہ علالت وہ نہ آسکے تھے اور اب دیدار کے بغیر مرے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ مژدہ بھی تھا کہ ریکارڈ پھاٹک کے پاس جھاڑی میں ہیں۔ پھر کیا تھا، نازو اپنی اس نئی کامیابی پر پھولی نہ سمائی۔
میں نے کہا: " اور اگر وہ کم بخت پوری کرتا رہا تمھاری فرمایشات "
" اگر ایسا ہی وہ قارون کا بچہ ہے تو بیاہ دوں گی تجھ کو " نازو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
" تجھے یہ سب گن آئے کہاں سے، تو شریف گھر میں پیدا ہی کیوں ہوئی ؟ توبہ! توبہ! شریف گھرانے کی لڑکی اور کوٹھے والیوں کی جیسی فطرت " میں نے جلبلا کر کہا۔
" نہ بی بی تم کسی کو پھانستیں ... " نازو کا منہ دبا دیا گیا اور دو ضرب شدید قسم کے تھپڑ مار دیے گئے۔
ریکارڈوں کی فرمایش کے بعد کتابوں کی فرمایش تھی۔ فرمایش کی اس کونین نے عاشق صاحب کا بخار بالکل ہی اتار دیا۔
ایک مرتبہ پھر زندہ باد نازو!
دو مہینے بعد وہی بدمعاش صاحب پھر دکھائی دیے لیکن کہاں اور کیسے؟ ہم لوگ گومتی کے قریب شام کو ٹہل رہے تھے وہی صاحب نیچی نظر کیے ہم لوگوں کے سامنے سے گزرے جیسے ہی انھوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا " فوراً مڑ گئے اور جس طرف سے آئے تھے اسی طرف بیرنگ واپس ہو گئے۔
" میں نے نازو کا منہ دبا دیا ورنہ وہ چیخنے ہی والی تھی " کتابیں ؟ "

# غالب اور بالغ

میرے بہت عزیز لیکن پریشان کن دوست پھکڑ داس کو شہر کے مختلف کونوں گوشوں اور تہہ خانوں سے مشتبہ، حواس باختہ، جھکی، خبطی اور گرو بڑ جھالا قسم کے انسانوں کو ڈھونڈ بلکہ کھود نکالنے میں خاص ملکہ حاصل تھا اور پھر ان نادرالوجود شخصیتوں کو جو ان سے ایسے ہی چمٹ جائیں جیسے مقناطیس میں لوہا۔ اپنے دوستوں سے متعارف کرانے بلکہ ان کے سر منڈھنے میں وہ بڑے فیاض اور عاقبت نااندیش واقع ہوئے تھے۔ ان کی اس حماقت کی بدولت نہیں معلوم کتنے سادھوؤں، پیروں فقیروں، جادوگروں، نجومیوں، شاعروں اور اسی قسم کے دیگر فنکاروں سے مجھے جبراً شرف نیاز حاصل کرایا جا چکا تھا اور ان میں سے بعض سے بعد میں جان چھڑانے کے لیے مجھے نہ صرف اپنا مکان بلکہ اکثر حلیہ تک تبدیل کرنا پڑا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ میں اپنے برآمدے میں بیٹھا نائی سے بال کٹوا رہا تھا کہ دفعتاً پھکڑ جی ایک موٹے تازے نچھندر قسم کے بزرگ کو جن کی کبھی گولہ گنج میں کپڑے سینے کی چھوٹی سی دکان تھی ساتھ لیے کسی بلائے بے درماں کی طرح اچانک نمودار ہوئے اور مجھے دیکھتے ہی چیخے "ریختی کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب! لیجیے حضرت نابالغ اجی توبہ حضرت بالغ کو تو میں لے آیا۔" گویا حضرت بالغ سے ملنے کے لیے میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ ہی تو رہا تھا اور میں نے ان کو اپنے غریب خانے پر پکڑ لانے کے لیے پھکڑ جی کی خاص طور سے متعین کیا تھا اور پھر انھوں نے اس روز شور اور طمطراق سے ان کا تعارف کرایا۔ "آپ جدید ترین شاعری کے تازہ ترین علمبردار ہیں۔ آپ ایک بالکل عجوبہ صنف شاعری کے جنم داتا ہیں۔ آپ نے حضرت غالب کو ایک حیات نو بخشی ہے۔ آپ دنیائے ادب میں آنے والے انقلاب کے نقیب ہیں۔ آپ شاہ راہ ادب پر روشنی کے ایک نئے مینارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ . . . . . وغیرہ وغیرہ۔"

بچارے حضرت بالغ کو اس مدت سرائی کے دوران، "ذرہ نوازی ہے آپ کی" کہتے ہوئے تین مرتبہ کرسی سے اٹھ اٹھ کر سلام کرنا پڑا اور جب میں نے عرض کیا، بڑی عزت

افزائی ہوئی آپ سے مل کر،" تو خلوص کی بدہضمی سے وہ پھکڑ جی سے بغل گیر ہونے کے بعد مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور میرے کپڑوں پر بالوں کی جو کٹی ہوئی فصل پڑی تھی اس کی وہ بے ساختہ بٹائی بھی کرا لے گئے۔

نائی نے میری جان چھوڑی تو میں غسل کرنے کے لیے تھوڑے وقفے کی مہلت چاہی لیکن پھکڑ جی کب ماننے والے تھے بولے "حضرت بغلول اچھا، یہ تو بالغ صاحب کا کلام سننے کے بعد غسل صحت کرو تو زیادہ مناسب ہوگا اور پھر حضرت بالغ کو اشارہ کیا" جی ہاں بس اب زیادہ نہ ترسایئے اور بقول شخصے شروع ہو جایئے ورنہ کہیں یہ غسل صحت غسل میت نہ ہو جائے۔"

حضرت بالغ خالی وقت میں کھکار کھنکور کر تیار ہی بیٹھے تھے فوراً چالو ہو گئے: "ذرہ نوازی ہے آپ کی" ایک نظم پیش کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ پھکڑ جی نے لقمہ دیا۔"پہلے نظم کا عنوان تو بتایئے۔ میں تو آپ کی نظموں سے زیادہ ان کے عنوانوں پر مرمٹتا ہوں،" حضرت بالغ نے حلق صاف کی "نظم کا عنوان کچھ طویل ہے لیکن عرض کیے دیتا ہوں۔ فرمایش عاشق کی معشوق سے بابت اٹھا دیے جانے رقیب کے بزم ناز سے اور تقاضا کرنا عاشق کا معشوق سے وصل کا بزعم اس کے کہ وہ اب نوکر ہے ساتھ ایک دھمکی کے اور جواب ناشایستہ مع کلمات تلخ و ترش معشوق کا عاشق کو اس کی فرمایش، تقاضا اور دھمکی کے باب میں۔"

پھکڑ جی پھڑک اٹھے" واللہ یہ نظم کا عنوان ہے یا کسی دل پھینک امیدوار کا الیکشن مینی فسٹو۔" غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھ پر ایک ٹکٹکے کا عالم طاری ہو چکا تھا۔

"ذرہ نوازی ہے آپ کی!" فرما کر حضرت بالغ یوں رواں ہوئے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے
میں نے کہا بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر ؟
یہ جانتا تو لٹاتا نہ گھر کو میں
اگر میری جان کو قرار نہیں ہے
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

نہ کہیو طعن سے پھر تم ، ہم ستمگر ہیں

پھکڑ جی واہ وا کرتے ہوئے چیخے " باغل صاحب۔ اجی توبہ بالغ صاحب ایسی ایسی قلیں باندھی ہیں آپ نے اور اس قیامت کا گریز فرمایا ہے کہ دن کو تارے نظر آنے لگے ہیں افسوس تو بس صرف اس قدر ہے کہ آج چچا غالب بقید حیات نہیں ورنہ ۔۔۔۔ میں کیا عرض کر رہا تھا ۔۔۔ جی ہاں ورنہ آپ خود قید حیات سے آزاد ہو چکے ہوتے"

حضرت بالغ " ذرہ نوازی ہے آپ کی " دہرا کر پھر گویا ہوئے

" اب ذرا معشوق کا جواب ملاحظہ ہو ۔

ہنس کے بولے تیرے سر کی قسم ہے ہم کو
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
بس چپ رہو ! ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے
ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
شرم تم کو مگر نہیں آتی
اب کسی بات پر نہیں آتی ؟

پھکڑ جی " بہت خوب ! یہ آپ ہی کا حصہ ہے ابلغ صاحب اجی توبہ بالغ صاحب " میری طرف مخاطب ہو کر " حضرت ! اس کو کہتے ہیں عالم آرائی ! "

میں نے فریاد کی " مجھے اس کلام کی شان نزول تو سمجھائیے ۔ معاف کیجیے گا مجھے تو وحشت ہو رہی ہے اسے سُن سُن کر ۔

پھکڑ جی نے میری بد مذاقی پر منہ بنایا ۔ حضرت بالغ نے کہا " ذرہ نوازی آپ کی ۔ میں آج کل دنیائے شاعری پر پلاسٹک سرجری قسم کا ایک بالکل انوکھا تجربہ یعنی قدیم شعرا کو جدید بنا رہا ہوں اور اس کے لیے میں نے سب سے پہلے حضرت غالب کو منتخب کیا ہے ۔"

پھکڑ جی " گویا تختۂ مشق بنایا ہے آپ نے سب سے پہلے ان کو جس طرح آپ پہلے کبھی نابالغ تھے اور اب ماشاءاللہ بالغ ہو چکے ہیں ۔ اسی طرح آپ ان شعرا کو جو پرانے ہو چکے تھے اپٹوڈیٹ بنا رہے ہیں ہا ہا ہا ۔ اس قسم کی اکھاڑ پچھاڑ سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے لیے قلم و دوات اور کاغذ کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ زیادہ تر کام صرف قینچی ہی سے نکل جاتا ہے ۔"

حضرت بالغ "ذرہ نوازی ہے آپ کی! جی ہاں میں عرض کر رہا تھا کہ میں حضرت غالب کے کلام کی پرانی شراب کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئی بوتلوں میں بند کر کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری شاعرانہ حمیت اور غیرت کو گوارا نہ ہوا کہ حضرت غالب جیسا مجرب اور مستند شاعر محض ایک قدیم شاعر کہلائے۔ چنانچہ میں نے اس کے ہی مصرعوں کو لے کر ان سے آج کل کے نئے موضوعات کی ایک دوسری دنیا آباد کر دی ہے اور اس طرح اسے جدید ترین شعرا کی صف اول میں کھڑا کر دیا ہے۔ آپ سنیں گے تو سر دھنیں گے کہ واقعی حضرت غالب میں ایک جدید ترین شاعر بننے کی کیسی کیسی صلاحیتیں موجود تھیں البتہ وقت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ خود فرمایا ہے ۔

ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھکڑ جی۔ غابل صاحب اجی توبہ بالغ صاحب آپ بالغ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ غالباً عاقل بھی ہیں لہذا آپ اس قسم کی تمہیدوں پر اپنا وقت مت ضائع کیجیے (میری طرف اشارہ کر کے) "اس قسم کے حضرات نہ مجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات"
آپ اب کوئی دوسری نظم سنائیے لیکن جی ہاں مع چٹنی کے میرا مطلب ساتھ عنوان کے"!

حضرت بالغ۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ دوسری نظم حاضر ہے۔ عنوان ہے اس کا دکھنا پانو معشوق کے بسبب دوڑ دھوپ غیر مناسب۔ فرمایش کرنا اس کا عاشق سے بابت داب دینے ان کے۔ غلط سمجھنا عاشق کا بوجہ ثقل سماعت فرمایش معشوق کی اور دابنے لگنا پیر پاسبان کے اور بدظن ہو جانا معشوق کا عاشق اور پاسبان دونوں سے"
پھکڑ جی۔ شکر ہے اغلب صاحب اجی توبہ بالغ صاحب کہ وہ آپ سے بدظن نہیں ہوا"

حضرت بالغ۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ نظم ملاحظہ ہو" ۔

مرجاؤں کیوں نہ رشک سے جب وہ تن نازک
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

پھکڑ جی۔ غالباً شاعر کو یہ رشک ہو رہا ہوگا کہ معشوق نے یہ کلیلیں اس کے ٹوٹے ہوئے مزار پر کیوں نہ بھریں۔ واللہ کیا لاحول میرا مطلب ماحول پیدا کیا ہے۔ آپ نے"

حضرت بالغ۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی" (اور پھر پہلے کے دونوں مصرعے دہرا کر)

دیکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے

کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے۔

. پھکڑ جی، غبلو صاحب اجی تو بہ بالغ صاحب کمال کر دیا آپ نے اور آخری مصرع کی اشاریت پر سر پھوڑ لینے کا جی چاہتا ہے۔ پاسبان کے پیر دب رہے ہوں گے تو معشوق پر کیا بیتی؟ آخر یہ منظر دیکھ کر اس نے اپنی چوڑیاں کیسے پھوڑیں؟

حضرت بالغ۔ ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔ آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟
کاش کہ تم میرے لیے ہوتے!

پھکڑ جی۔ ابغل صاحب اجی تو بہ بالغ صاحب آپ نے تو واقعی قلم توڑ دیا بلکہ قینچی کند کر ڈالی بلکہ سچ پوچھیے تو دیوان غالب چاک کر ڈالا ہے دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے۔ لیکن ابھی پیاس بجھی نہیں بلکہ اور بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

حضرت بالغ۔ ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔ ایک دوسری نظم ملاحظہ ہو!
عنوان ہے پینا شراب قرض شاعر کا، بنا کر بھیس فقیروں کا ساتھ اس امید کے کہ نہ دینا پڑیں دام اس کے بوجہ آجانے رحم ساقی کو اور برتاؤ سخت ساقی کا اور مارا جانا شاعر کا مع اقبالِ جرم اس کے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
زلفِ سیاہ رُخ پر پریشاں کیے ہوئے
قرض کی پیتے تھے مے اور کہتے تھے ہاں
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے
دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے
کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ آجائے رحم
ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
جو تم سے شہر میں دو چار ہوں تو کیوں کر ہوں
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہیے؟

پھکڑ جی۔ مجھ سے قسم لے لیجیے کہ ہاتھ میں جو تا ہی ہوگا۔ لیکن پھر آخر ہوا کیا؟

حضرت بالغ۔ ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔ آخری ٹکڑے کو حُسن سماعت بخشیے شاعر عرض کرتا ہے ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
نہ بھاگا جائے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے مجھ سے
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور ہے

پھکڑ جی (جھوم کر) یہ شاعری نہیں الہام ہے الہام۔ جوبلو صاحب! جی تو یہ بالغ صاحب آپ پر معلّم الملکوت براہ راست نازل کر رہا ہے۔

حضرت بالغ۔ ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔ ایک نظم آپ کے مذاق کی ہے ذرا توجہ سے ملاحظہ فرمائیے گا۔ عنوان ہے جانا معشوق کا عاشق کے گھر غالباً بہ نیت سرقہ۔ دھونا پیر عاشق کا معشوق کے ساتھ کھینچ تان نا مناسب اور زخمی ہو جانا پیر معشوق کے اور فرمائش بے ہودہ معشوق کی عاشق سے اور سراسیمگی عاشق کی معشوق کی نیت میں فتور دیکھ کر۔

اب بالغ صاحب آٹومیٹک ہو چکے تھے یعنی خود چالو ہو کر کسی مزید تحریک کے بغیر اپنی نظم اگلنے لگے تھے۔

پھکڑ جی: بھئی اس نظم میں تو بارہ سالوں کا لطف آ جائے گا۔"

حضرت بالغ۔ ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔

وہ آئیں گھر ہمارے خدا کی قدرت ہے
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے ؟
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

---

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
روز پیتا ہیں، پی لیتا ہوں گا ہے گا ہے
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

---

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
شوق فضول و جرارت انداز چاہیے
کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
ننگ پیری ہے جوانی میری
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

پکوڑا جی: (سر پیٹتے ہوئے) غبلو صاحب! جی تو یہ بالغ صاحب آپ نے تو بلوغیت میرا مطلب بلوغیت کے تمام ہی مدارج طے کر ڈالے ہیں اپنی اس کھچڑی میں۔ بس اب ایک آخری باونڈری اور ہو جائے۔ سر جائے یار ہے پر نہ رہیں کہے بغیر (میری جانب اشارہ کر کے) گھور رہے ہیں جلاد کی طرح یہ! آج تک یہ صرف صاحب سیف اور صاحب قلم کے قائل تھے لیکن اب ان جیسے درپئے اعتراض کو بھی آپ جیسے صاحب مقراض کا لوہا ماننا پڑے گا۔"

میں: تو کیا حضرت بالغ کا پورا دیوان آج ہی سن ڈالنے کا ارادہ ہے؟"

پھکڑ جی۔ بوغلے صاحب اجی تو بہ بالغ صاحب آج کا کام کل پر ٹالنے کے قائل نہیں یہ چلے تو بس چلتے ہی چلے جاتے ہیں۔"

تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا

حضرت بالغ۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی ؎

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
شب کو ان کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہو گئیں
جتنے عرصے میں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

پھکڑ جی (اٹھ کر حضرت بالغ سے بے ساختہ بغل گیر ہو جاتے ہیں)۔ "سبحان اللہ سبحان اللہ! واقعی یہ شاعری نہیں ہذیان عالی نشان ہے۔ آسمان سے براہ راست تارے توڑ لائے ہیں آپ! اس کو سن کر بس کچھ اس قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ۔ ع
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں! لیکن ابغن اجی تو بہ بالغ صاحب اس نظم کا عنوان تو بتایا ہی نہیں آپ نے گویا بغیر دولہا کے شادی رچا دی۔"

حضرت بالغ۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ اس نظم کا عنوان ہے۔ ۔ ۔ ۔"

میں کرسی چھوڑ کر بھاگ نکلا اور پھکڑ جی اور حضرت بالغ پروٹھے تک میرے پیچھے چیختے ہوئے دوڑے۔ "اجی اس نظم کا عنوان تو فردوس گوش کرتے جائیے۔"

میرے میدان چھوڑ بھاگنے کے بعد پھکڑ جی حضرت بالغ کو اپنے ساتھ کچھ اس انداز سے لے کر چلے جیسے کوئی مداری اپنے کسی ہونہار جانور کو ڈگڈگی بجاتا ہوا لیے چلتا ہے اس اعصاب جھنجوڑ تجربے کے بعد مجھے اپنی عافیت صرف اس میں نظر آئی کہ دوڑ کر غسل خانے میں پناہ گزیں ہو جاؤں۔

# مزاج پُرسی

سنتے ہیں کہ مزاج پرسی بھی ایک فن ہوتا ہے۔ ضرور ہوتا ہوگا۔ جب چھینکنے اور ڈکار لینے جیسے اضطراری اور خود کفیل حرکات کے متعلق ایٹیکیٹ کے باقاعدہ اصول مرتب کیے جا چکے ہیں اور انھیں خوش اسلوبی سے برتنے والوں کو اونچی سوسائٹی میں فن کار مانا جاتا ہے تو پھر مزاج پرسی کو ایک فن کیوں نہیں قرار دیا جاسکتا؟ یہ تو بہر صورت ایک ایسی سماجی ریت اور رسم ہے جو ہر موقعے پہ ہر موسم میں، بلکہ بے موقع اور بے موسم بھی، اعلا سے اعلا ترین اور ادنا سے ادنا ترین سوسائٹی میں یکساں طور سے پائی جاتی ہے اور جس کی تکمیل کے لیے کم سے کم دو اشخاص کی موجودگی لازمی ہوتی ہے، ایک مزاج والے کی اور ایک مزاج پوچھنے والے کی اور دونوں ہی کو اپنا اپنا رول اس انداز سے ادا کرنے کے لیے کہ وہ ایک دوسرے کو متاثر اور مرعوب کر سکیں اچھی بھلی اداکاری بھی کرنا پڑتی ہے اور آج کل کی دنیا میں کون ایسا معصوم ہے جو اداکاری کو نہ صرف ایک فن بلکہ سب سے بڑا فن نہیں تسلیم کرتا۔ آپ چاہیں تو اِس سلسلے میں کسی آٹھ برس کے بچے یا بچی سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں اور وہ آپ کی معلومات میں مزید اضافے کے لیے فلم انڈسٹری کے پندرہ بیس فن کاروں کے نام اور اُن کی تاریخ پیدائش بھی بتا دے گی۔

مرزا غالب اپنے محبوب کی مزاج پرسی کرنے کے لیے آنے پر کچھ غلط قسم کی اداکاری کر بیٹھے تھے چنانچہ انھیں اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا تھا اور محبوب نے اُن کی بیماری کو محض معشوق فریبی کا ایک ڈھونگ سمجھ کر اُن کے لیے جو یخنی اور حریرہ بنانا تھا اُسے موقوف کر دیا تھا۔ مرزا نے اپنی بچکانہ اداکاری کا خود بھی اعتراف کیا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آتی ہے مُنہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

جس طرح ہمارے انتخابات میں چاہے جتنی بھی ہنگامہ آرائی، زبردستی، بدعنوانی اور زرافشانی کی جائے اس کے نتیجے کو جمہور کی آواز ہی کہا جاتا ہے۔ اُسی طرح مزاج پُرسی کی لطافت میں خواہ کتنی ہی کثافت اور خباثت کو شامل کر لیا جائے اُس کا سرچشمہ غم خواری اور دردمندی ہی سمجھا جاتا ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ بعض من چلے لوگ اپنے تلخ تجربوں کی روشنی میں مزاج پُرسی کو ڈانٹنے، ڈپٹنے اور سزا

دینے کے مترادف سمجھتے ہیں اور بعض اوقات سرِعام کچھ اس قسم کے جملے بھی سننے میں آتے ہیں۔ "آپ کی بیگم صاحبہ آپ کی یہ باتیں سن پائیں تو ایسی مزاج پرسی کریں گی کہ آپ کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا" یا "اچھا شرما جی کو آنے دیجیے۔ اُن کے سامنے اگر آپ ایسے اِفراط بنے تو وہ کس کر ایسی مزاج پرسی کریں گے آپ کی کہ دن میں تارے نظر آجائیں گے۔" وغیرہ وغیرہ۔

ہم اُس دور سے تو خیر صحیح و سالم نکل گئے۔ جب بچپن میں گھر کی چیزیں الٹنے پلٹنے پر والدین یا لڑکپن میں سبق نہ یاد کرنے پر استاد یا جوانی میں دیر سے گھر پہنچنے پر بیوی ہماری مزاج پرسی کیا کرتی لیکن اب جب کہ ہم جوانی کی سنہری شام اور اُس کے خوبصورت بڑھتے ہوئے سایوں سے بھی آگے بڑھ کر بڑھاپے کے تاریک دھندلکوں میں داخل ہو چکے ہیں اور ہمیں آئے دن طرح طرح کی بیماریاں گھیرتی رہتی ہیں تو ہمیں اپنی ہر بیماری سے مہلک وہ مزاج پرسی معلوم ہوتی ہے جو اُس کے متعلق اپنے خلوص اور محبت سے ہمارے دوست اور احباب کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو اس زمانے میں ہمیں سب سے بڑی بیماری یہ مزاج پرسی ہی لاحق ہے اور اُس سے جانبر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب ہم اکثر کچھ اس قسم کے شعر گنگنایا کرتے ہیں۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار

اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

چھٹی کا دن تھا، ہم منہ اندھیرے ہوا خوری کو گئے تو خورشید صاحب لائق مل گئے۔ انھوں نے اپنا کلام کچھ گفتنی اور زیادہ تر ناگفتنی سنایا تو ہم بہت محظوظ ہوئے۔ لوٹ کر آئے، نہائے اور ڈٹ کر ناشتہ کیا تو اپنے آپ کو بڑا ہشاش بشاش محسوس کیا۔ بیوی بچوں سے کہا آج میٹنی شو سینما دیکھیں گے اور باہر برآمدے میں آ کر جولانی طبع میں گنگنانے لگے۔ اتنے میں ہمارے بزرگ دوست مرزا اسد حسین آ گئے علیک سلیک کے بعد بولے:

"اجی آج آپ کچھ بجھے بجھے سے کیوں لگ رہے ہیں؟ بلڈ پریشر ٹھیک ہے نا!"

ہمارے سینے پر ایک گھونسا سا پڑا۔ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ کم سے کم ہر پندرھویں روز خون کا دباؤ چیک کرا لینا چاہیے لیکن ہم چار مہینے سے غوطہ کھائے ہوئے تھے۔ ہم نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔

"جی ہاں بس اچھا ہی ہوں۔ رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی" اور ہمیں واقعی یاد آ گیا کہ کل رات کو کئی دفعہ آنکھ کھل گئی تھی۔

مرزا صاحب کے چہرے پر کچھ ایسے رقت انگیز اثرات طاری ہو گئے جیسے دفعتاً اُن کے پیٹ میں بہت شدید درد ہو رہا ہو" رات کو نیند نہیں آئی؟ یہ بات تو کافی تشویشناک ہے۔ آپ نے ڈاکٹر اگنی ہوتری کو دکھایا؟ بھائی اِس عمر میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ اپنی بلڈ شگر کی آج ہی جانچ کرا ڈالیے۔ جی آپ مکند لال کو تو جانتے ہی ہوں گے، اُس پر فالج گرا ہے اور آج کل اسپتال میں ہے۔ وہ بھی اچھا

بھلا تھا صرف رات کو نیند نہ آنے کی شکایت تھی۔ فالج گرا اور جانچ کی گئی تو پتا چلا کہ اُسے پچاس فی صدی شکر آ رہی تھی۔ نہیں معلوم کب سے ذیابیطس نے دبوچ رکھا تھا اُسے اور وہ آپ ہی کی طرح بے خبر تھا۔"

ہم نے مرزا صاحب سے زیادہ اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کی "یوں تو خوب نیند آتی ہے ہمیں، جب تک محلّے میں کہیں شادی نہ ہو اور لاؤڈ اسپیکر کان نہ پھوڑے۔ کل نہیں معلوم کیسے دو بلیاں پڑوس میں گھس آئی تھیں اور ٹین کے سائبان پر اُدھم مچا رکھا تھا!"

اور ہم دل ہی دل میں یہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ ایک دفعہ تو ہم بلیوں کی دھما چوکڑی سے جاگ گئے تھے لیکن دوسری اور تیسری دفعہ ہماری آنکھ کیسے کھل گئی تھی؟ مرزا صاحب نے بڑے بھیانک انداز سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا "میاں گربہ کشتن روزِ اول! آپ بلا تاخیر اپنا علاج فوراً شروع کر دیجیے۔ یہ بلیاں وغیرہ سب آپ کا واہمہ ہیں جب نیند نہیں آتی ہے تو پھر نہ کچھ تو آوازیں آتی ہی رہتی ہیں۔ آخر آپ کے ساتھ محلہ بھر کیوں نہیں جاگا۔ میری گلی میں تو رات بھر کتے دہ چل پوں مچاتے چیختے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے ہیں کہ ہو بہو یہی معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ودھان سبھا کا اجلاس ہو رہا ہو لیکن میرے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی بلکہ ہماری بیگم تو یہاں تک کہتی ہیں کہ اکثر ہمارے خراٹے سن کر بڑے جہازی تو خیر نہیں البتہ ٹینی ٹائپ کے کتے بھونکنا بند کر کے بھاگ جاتے ہیں۔"

ہم نے طرح طرح سے مرزا صاحب کو اپنی درستیِ صحت کا یقین دلایا لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ درمیان میں اُنھوں نے ایک دوسرا محاذ کھول دیا یعنی دس برس پہلے ایک دفعہ جو ہمارے درد گردہ اٹھا تھا اُس کو گھسیٹ لائے اور اس موضوع پر کہ کس طرح اندر ہی اندر گردے گل جاتے ہیں اور صاحب گردہ کو پتا بھی نہیں چلتا ایک وحشت انگیز مقالہ پڑھ ڈالا۔ پھر انھوں نے شہر میں نصف صدی کے اندر جتنی موتیں ہوئی تھیں اُن کے امراض گنوا ڈالے اور پھر اُن کا کسی نہ کسی طور سے جائز یا ناجائز رشتہ میری اُن شکایتوں اور تکلیفوں سے جوڑ دیا کہ جن کے علم سے ہم بالکل بے خبر تھے۔ آخر میں انھوں نے ہماری اِس بے خبری کے مرض کی بھی معقول تشخیص کر دی۔ ضعف معدہ کے سلسلے میں اُنھوں نے حکیم نوازش القدوس صاحب کا نام لیا تھا۔ چار پانچ منٹ کے بعد انھوں نے جب ہم سے پوچھا کہ ضعف معدہ کے سلسلے میں کس کا علاج کر دگے اور ہم نے غیر حاضر دماغی میں کہہ گیا "حکیم جوارش جالینوس صاحب کا" تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور فرمایا "آپ کی کھوپڑی میں مغز کے بجائے جو گوبھی کا پھول ہے وہ بھی مرجھایا ہے۔"

میں اُن کی اس ساری گفتگو سے اِس قدر مبہوت اور مسحور ہو کر رہ گیا تھا کہ چلتے وقت جب انھوں نے ہمارے ایک دانت کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اور تمھارے اس دانت کے درد کا کیا حال ہے؟" تو یقین جانیے گا کہ ہمیں اِس اچھے بھلے دانت میں ایک لرزہ خیز ٹیس سی اُٹھتی محسوس ہوئی اور ہم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دباتے ہوئے کہا "بس بجلیاں کوندرہی ہیں بجلیاں!"

مرزا صاحب چلے گئے تو ہم اپنی زندگی سے مایوس اپنے سونے کے کمرے میں اوندھے پیٹ کر

پڑ رہے۔ خود ہمیں اپنے جسم سے کفن اور کافور کی بو آتی محسوس ہوتی۔ بیوی میٹنی شو کی یاد دہانی کرانے آئیں تو ہم نے کراہتے ہوئے کہا "تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں۔ طبیعت بہت خراب ہے" کہنے لگیں "تو کسی ڈاکٹر کو بلواؤں" ہم نے پہلے سے بھی زیادہ کراہتے ہوئے کہا "جی لاعلاج امراض کے لیے ڈاکٹر اور حکیم سب بیکار ہیں۔ کسی وکیل کو بلائیے تاکہ ہم اپنا وصیت نامہ لکھا دیں! اور قبرستان میں ہم نے جو اپنے لیے زمین خریدی ہے اُس کے کاغذ کو ذرا احتیاط سے رکھیے گا"!

اس تحریر سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ محض ایک جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ریکارڈ کو صحیح رکھنے کے لیے عرض کیا جاتا ہے کہ جب مذکورہ بالا مرزا صاحب کا انتقال پُرملال ہوا تو ہم نے اور اور ہمارے ہی جیسے اُن کی مزاج پُرسی کے شکار مظلوموں نے اُن کا جنازہ اس عقیدت اور احترام سے اُٹھایا کہ ہم میں ہر ایک پر یہ شعر صادق آیا:

اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسد کی لاش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے!

مبادا یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مرزا اسد حسین صاحب مرحوم کی وفات کے بعد سے ہماری مزاج پرسی ہی بند ہو گئی۔ جی نہیں۔ اُن کی حیات میں بھی اور اُن کی ممات کے بعد بھی ہماری مزاج پُرسی نے والوں اور والیوں میں نہ کوئی کمی تھی اور نہ ہے اور اس سلسلے میں ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں والی بات صادق آتی ہے۔

ایک بار ہمارے ایک مزاج پرسی کرنے والے دوست مسٹر شکلا کی لگائی بجھائی میں آکر ایک ڈاکٹر جو اپنے آلوں سے زیادہ اپنے کانوں پر بھروسا کرتا ہمارے متعلق یہ شبہہ ظاہر کر کے کہ ہم پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے، ہمیں مکمل آرام کرنے کا مشورہ دے گیا۔ ہماری بیوی شاید اِس کی پہلے ہی سے منتظر تھیں چنانچہ انھوں نے ہمیں فوراً حراست میں لے کر نہ صرف خواب آور گولی کھلانے کے ساتھ ہی بستر پر لٹا دیا اور کمرے کے سارے پردے کھینچ کر گھپ اندھیرا کر دیا بلکہ خود اپنے آپ اور بچّوں کو دوسرے حصّے میں منتقل کر کے گھر میں ایسا سکوت طاری کرا دیا کہ ہمیں اپنی سانس کی آواز اور نبض کی دھمک سنائی دینے لگی اور بالآخر تھوڑی دیر بعد بادلِ ناخواستہ ہم بھی اپنے خلاف سازش میں شریک ہو گئے یعنی سو گئے مگر دل کا دورہ پڑنے کے خوف میں نہیں بلکہ اُس کے انتظار میں۔ لیکن دل کا دورہ شکل بدل کر اندر سے پڑنے کے بجائے باہر سے پڑا کمرے میں خاموشی سے اندر آنے کے بعد۔

"چھبّن! بیٹا چھبّن! ارے ایک بار تو آنکھیں کھول دے!" کوئی مجھ پر جھکا ہوا میری ناک میں چیخ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں لیکن کمرے کی نیم تاریکی میں ایک وحشت زدہ چہرے کو اپنے چہرے سے بالکل قریب پا کر میں غیر ارادی طور سے اُن کو پھر بند کر لینے پر مجبور ہو گیا۔

"ہائے بیچارہ اب تو پہچان بھی نہیں پاتا!" کہتی ہوئی میری رشتے کی خالہ فہمیدہ بیگم فرش پر لیٹ گئیں اور لوٹ لوٹ کر میری جواں مرگی کا ماتم اور بین کرنے لگیں۔

پھر کیا ہوا؟ وہی جو ہونا چاہیے تھا۔ گھر پر کرفیو والی جو فضا طاری تھی وہ چٹکی بجاتے ختم ہو گئی۔ سارے گھر والے دوڑ پڑے۔ پردے ہٹا دیے گئے کمرہ بقعہ نور ہو گیا۔ ہم کو اپنی زندگی کے ثبوت میں بیٹھ جانا پڑا۔ فہیدہ خالہ ہمارے پاس ہی مسہری پر مع پاندان جلوہ افروز ہو گئیں اور صمد میاں کے یہاں شادی میں سمدھنوں میں جو تو، تو میں، میں ہوئی تھی اُس کی داستان باتصویر یعنی باقاعدہ اُن کی حرکات اور لہجوں کی نقل کر کرکے سنانے لگیں۔ جس طرح نادر شاہ نے ایک چھوٹی سی مسجد میں بیٹھ کر اپنی فوج کو دہلی میں قتل عام کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اسی طرح ہماری خالہ نے ہمارے کمرے میں بیٹھ کر اُسے چھ سات ناتی پوتوں کو جو اُن کے ہمراہ آئے تھے یہ کہہ کر کہ جاؤ باہر کھیلو کودو ہمارے گھر میں، توڑ پھوڑ کرنے کی ایک کھلی چھوٹ دے دی۔

خالہ کی اِس فوج نے ہمارے گھر اور باغیچے میں کیسی کیسی غارت گری کی اور تباہ کاری مچائی اس کا تذکرہ غالباً اِس وجہ سے بے محل ہوگا کیونکہ اِس کا تعلق ہماری مزاج پُرسی سے نہیں بلکہ ہماری اس کس مپرسی سے ہے جس کے بیشتر میزبان شکار رہتے ہیں۔ البتہ ہم بطور مریض اِس بات کے ضرور شکر گذار ہیں کہ جو کھٹی اور کڑوی دوا ڈاکٹر نے ہمیں دن میں تین بار، چار روز تک پینے کو بتائی تھی اُس کو تین لڑکوں نے چار گھونٹ میں ختم کر دی اور جو اُبکائی پیدا کرنے والی گولیاں ہمارے لیے تین روز کے حساب سے چار دن کے لیے تجویز کی گئی تھیں اُن کا چار لڑکوں نے تین سکنڈ میں وارا نیارا کر دیا۔ خالہ کے ایک طول عمرہٗ نے وہ نسخہ بھی جو کہ ڈاکٹر کے یہاں جانے کا ہمارا پاسپورٹ تھا، پھاڑ کر ختم کر دیا۔ شام کو ہمارے بجائے ہمارے محسن لڑکے ہی ڈاکٹر کے یہاں لے جائے گئے۔

## یادگارِ غالب

مصنف : الطاف حسین حالی

صفحات : 220

قیمت : -/66روپے

## تلاشِ آزاد

مصنف : عبدالقوی دسنوی

صفحات:140

قیمت : -/60روپے

## اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

مصنف : عبدالقوی دسنوی

صفحات : 184

قیمت : -/72روپے

## سوالوں میں رنگ بھرے

مصنف : وہاب قیصر

صفحات:128

قیمت : -/57روپے

## ذکرِ خیر

مصنف : یوسف ناظم

صفحات:148

قیمت : -/54روپے

## شریف زادہ

مصنف : مرزا رسوا

صفحات : 200

قیمت : -/62روپے

## تنقید کیا ہے

مصنف : آل احمد سرور

صفحات : 200

قیمت : -/62روپے

## تعلیم، نظریہ اور عمل

مصنف : محمد اکرام خاں

صفحات : 216

قیمت : -/52روپے

ISBN 978-81-7587-594-4

₹ 53/-